Kradecam

vol. 11 (June, August),

1939

ماہ جون ۱۹۳۹ء

نمبر پی ۲۹۴ جنوبی بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

ندیم

مرتبہ

سید ریاست علی ندوی

مطبوعہ ندیم پریس کچہری روڈ گیا

آئینۂ ندیم

یعنی

ماہنامہ ندیم گیا

کی

گیارہویں جلد کے مضمون نگار شعرا اور مضامین نثر و نظم کی مفصل فہرست

از

ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا ماہِ جون سنہ ۱۹۳۹ء

مرتبہ

سیّد ریاست علی ندوی

فہرست مضمون نگاران ندیم

جلد ۱۱ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۳۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب ایم۔ اسلم اف لاہور	۱۱۰
۲	جناب الیاس اسلام پوری	۱۹
۳	جناب سید اظہر الحق صاحب قادری سونپرساوی	۱۴۳، ۲۸۵
۴	جناب محمد توحید صاحب عظیم آبادی	۱۴، ۱۰۰، ۲۶۴
۵	جناب جی۔ آر قیتہ شیخپوروی	۱۸۷
۶	جناب حکیم حبیب الرحمٰن صاحب پرنسپل طبیہ کالج ڈھاکہ	۲۲۹
۷	جناب حمید عظیم آبادی	۲۱۷
۸	جناب حمزہ ذکی عظیم آبادی	۱۲۳
۹	سید ریاست علی ندوی	۲، ۵، ۶۷، ۸۵، ۸۶، ۹۰، ۱۵۱، ۱۴۰، ۱۵۲، ۱۶۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۶، ۲۳۱، ۲۹۱، ۲۹۸، ۳۱۰، ۳۴۳
۱۰	جناب شبیر احمد صاحب تقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۴، ۳۴۵
۱۱	مولانا سید سلیمان ندوی مد ظلہٗ	۱۵۷
۱۲	جناب سہیل عظیم آبادی	۱۲۴
۱۳	جناب سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم۔ اے ایڈوکیٹ لکھنؤ	۲۱۴
۱۴	جناب عابد علی عابد ایم۔ اے پروفیسر لاہور یونیورسٹی	۲۸۳

قیمت سالانہ للعہ
قیمت فی
پرچہ ۱ ۳۹۱

رسالہ "ندیم" گیا

مرتبہ: سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۱	ماہ ربیع الاخری ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۳۹ء	نمبر ۶

نئی مطبوعات رسائل و خاص نمبروں کے تبصرے آئندہ مہینہ میں شائع ہونگے "منیجر"

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر و پرنٹر و پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا

نظرات

ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں کشیدگی کے بنیادی اسباب میں وہ تاریخی کتابیں بھی ہیں جو غیر ملکیوں کی لکھی ہوئی یا انہی کو ماخذ بنا کر ہندوستانیوں کی مرتب کی ہوئی ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔ مدت گذری کہ اس روگ کو پہچاننے والوں نے پہچان لیا تھا۔ مگر کیسی حیرت کی بات ہو کہ اسوقت تک اس مرض کے علاج کیلئے کوئی ایک نسخہ بھی لکھا نہیں گیا۔ اگر ہندوستان کے باہر کسی پنڈت ملّے سے یہ کہا جائے کہ ہمارے یہاں اپنی زبان میں اپنے ملک کی کوئی بھی اور بھروسہ کی تاریخ نہیں ہو تو اسکو کتنا اچنبھا ہو۔ اس ضرورت کا احساس پہلی مرتبہ دارالمصنفین کو ہوا کہ اردو زبان میں ہندوستان کے اسلامی عہد کی محققانہ جامع اور مستند تاریخ مرتب کی جائے۔ پھر اسی کو ماخذ بنا کر اسکولوں اور کالجوں کیلئے درسی کتابیں تیار کرائی جائیں۔ چنانچہ اس تجویز کو عمل میں لانے کیلئے بزم تاریخ ہند کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۰ جلدوں میں اسکو مرتب کرنے کا خیال کیا گیا۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذۂ تاریخ نے ایک ایک جلد کی ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ کچھ جلدیں دارالمصنفین کے رفقا کے لئے خاص کی گئیں۔ اس سلسلہ میں سلاطین شرقیہ بہار اور بنگال وغیرہ کی ایک جلد کی ترتیب کی خدمت کا قرعہ راقم سطور کے نام بھی نکلا تھا۔ اس سلسلہ کی ابتدائی ایک دو جلدیں لکھی جا چکی ہیں جن کی اشاعت غالباً ایک دو سال میں ہو جائیگی۔ بزم تاریخ ہند کا اجمالی نظام عمل 'معارف' میں شائع ہو چکا ہے۔

اس پورے سلسلہ تاریخ کے شائع ہونے تک میں ہزاروں ہزار کے مصارف کی ضرورت تھی۔ دارالمصنفین اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلا سکتا تھا۔ اسلئے اس پورے سلسلہ کے انجام پذیر ہونے میں شمارہ بیس سال سے کم مدت صرف نہیں ہوتی تھی۔

کبھی برائی سے بھی بھلائی نکل آتی ہے۔ ادھر ملک کے سیاسی ماحول کے بدل جانے اور جابجا فرقہ وارانہ جھگڑوں کے اٹھ کھڑے ہونے سے سوچنے والے دماغوں میں ریاست کی تاریخی کتابوں کی اس خامی کا تصور تازہ ہوا۔ اور یہ دیکھکر خوشی ہوتی کہ مختلف حکومتوں نے اسکی ضرورت محسوس کی چنانچہ حکومت یوپی اور حکومت نظام کے محکمۂ تعلیم ایسے اسلوب میں اسکولوں کیلئے تاریخی کتابیں لکھوانے کا اعلان ہیں جن سے فرقہ وارانہ زہریلے اثرات دور ہوں اور جو ہندوستان کی معاشرتی، اجتماعی اور تہذیبی زندگی کو اجاگر کریں۔ لڑائی جھگڑے حصوں کو حذف کیا جائے اور ایسے واقعات نظر انداز کردئے جائیں جو دو قوموں میں جذبۂ منافرت کو ابھارنے والے ہوں۔ یہ بہا مبارک کوششیں ہیں۔ اور ایسی کتابوں سے ہماری وقتی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ لیکن دراصل یہ مرض کا اصلی علاج نہیں ہے۔ یہ صحیح جیسا کہ سمجھا جا سکتا ہو کہ تاریخ کے مواد خام مسالے ہیں۔ انہیں جیسے چاہئے ترتیب دے لیجئے۔ لیکن ایسی کتابیں نہ بھروسہ پیدا کر سکیں اور نہ نگاہوں میں ان کا وزن قائم ہو سکتا ہے۔ اصل ضرورت ہو کہ تاریخی مواد اور واقعات صحیح طریقے سے جانچے اور پرکھے جائیں

صورت میں نہ واقعات کی صحیح شکلوں کو چھپانے کی ضرورت ہوگی، اور نہ ان سے نظر بچانے کی ضرورت۔ لیکن یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا نہیں ہے۔ اسکو کوئی مستقل ادارہ ہی انجام دے سکتا تھا۔ جیساکہ دارالمصنفین نے اس کا آغاز کیا تھا۔ یہ دیکھکر ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ اس فرض کا احساس ہمارے صوبہ کے وزیر تعلیم آنربیل ڈاکٹر سید محمود کو ہوا ہے۔ اور انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی ایک مفصل اسکیم شائع کی ہے۔

آنربیل موصوف اسی مقصد کیلئے ایک ادارہ (بورڈ) پٹنہ میں کھولنا چاہتے ہیں جسمیں اسلامی ہند کی تاریخ پر ریسرچ کیا جائے اور اس سے جو کتابیں مرتب ہوں۔ انکو ماخذ قرار دیکر دری کتابیں لکھائی جائیں۔ آنربیل موصوف نے دوسرے صوبوں کی حکومتوں کو بھی معاونت کی دعوت دی ہے تاکہ بڑے پیمانہ پر اس کا آغاز ہو۔ اس ادارہ میں ۴ اڈیٹر اور ۱۲ ریسرچ اسکالر ہونگے، اور تخمینہ لگایا گیا ہے کہ وہ تین سال میں ریسرچ کا کام پورا کریں گے۔ اس ادارہ کے ذریعہ غیر معمولی خدمات انجام پاسکتے ہیں، بشرطیکہ اشخاص کے انتخاب میں انکی تعلیمی ڈگریوں کے بجائے انکی وسعت نظر، مطالعہ، مشق، تجربہ، سلیقہ کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ ہم آنربیل موصوف کو مشورہ دینگے کہ وہ اس بورڈ کو قائم کرتے وقت دارالمصنفین کے پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کیلئے اس کے اکابر سے بھی مشورہ لیں۔ کیونکہ وہ ایک چھوٹے پیمانہ پر اس کام کو اسوقت جاری کئے ہوئے ہیں۔ اور اس لئے وہ اسکیم کی رہنمائی میں مفید حصہ لے سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ اس ادارہ کے ذریعہ اسلامی ہند کی تاریخ کی بنیادی خدمت انجام پا جائے گی۔

اسلامی ہند کے صحیح حالات کا ایک سرسری جائزہ لینے کیلئے مکتبۂ ندیم سے ایک مختصر کتاب "مرقع اسلامی ہند" کے شائع کرنے کا خیال ہے۔ یہ اڈیٹر ندیم کے ان مضامین کا مجموعہ ہوگا، جو اسلامی ہند کے خاص موضوعوں پر معارف میں شایع ہوتے ہیں۔ اور استناد اور سنجیدگی کی نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع پر شائع ہوگی اور غالباً ۱۴، ۱۵ مضامین کا مجموعہ ہوگی۔ مضامین کے عنوانات مثلاً یہ ہیں:- "ہندوستان آٹھویں صدی ہجری میں"۔ "کیا عالمگیر کے عہد میں تاریخ نویسی قانوناً جرم تھی"۔ وغیرہ مجموعہ کے مضامین کی ترتیب ایسی رکھی جائیگی کہ اسلامی عہد کے تاریخی جغرافیہ اور تمدن معاشرت کے مختلف شعبوں، نظام حکومت، نظام تعلیم اور اکابر رجال کے علمی و ادبی کارناموں اور معاشرتی حالات کے خط و خال نمایاں ہوں۔ توقع ہے کہ اس کا مطالعہ تاریخ کے طالب علموں کیلئے سودمند ہوگا۔

جناب گنپت سہائے سریواستو ایم۔ اے الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں ریسرچ اسکالر ہیں، وہ ان دنوں اردو ادب میں ہندوؤں کی خدمات کے عنوان پر کام کر رہے ہیں۔ اس میں ہندو اہل قلم و شعراء و غیرہ کے تذکرے کئے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب ذوق کے علم میں ان ہندو حضرات کے متعلق جن کے تذکرے بہار گلشن، خمخانۂ جاوید اور بہار سخن میں آئے ہیں کچھ مزید معلومات ہوں تو ان سے موصوف کو مطلع کریں، نیز موصوف موجودہ دور کے اردو کے ہندو مصنفین اور شعراء سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے مختصر سوانح اور خدمات سے انہیں مطلع کریں۔ موصوف سے اردو ڈیپارٹمنٹ الہ آباد یونیورسٹی کے پتہ سے خط و کتابت کی جا سکتی ہے۔ ان اہل قلم کا ذکر

مختلف دوروں اور مقامات کے ملاحظے کیا جائیگا۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارے صوبہ کے ہندو شعرا اور مصنفین اپنے حالات اور خدمات سے مصنف کو مطلع کرکے ہمارے صوبہ کی نمائندگی کا فرض انجام دینگے۔ امید ہے کہ اس محققانہ تصنیف سے اردو ادب کی قابل قدر خدمت انجام پائیگی

پچھلے مہینے یہاں ان صفحات میں صوبہ بہار کی عدالتوں اور دوسرے سرکاری دفتروں میں اردو کے استعمال سے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا ناظرین کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ ہمارے اسکے جواب میں حکومت کی جانب سے مطلع کیا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں ضروری کاروائی عمل میں لائی جائے گی۔ ہمیں آیندہ ان کاروائیوں کے معلوم کرنیکا اشتیاق رہیگا۔ اس سلسلہ میں حکومت کیلئے جو کام سب سے پہلے کرنا ہے وہ ان فارموں کا اردو اور ہندی دونوں رسم خطوں میں طبع کرانا ہے جو سرکاری دفاتر سے پبلک کے نام بھیجے جاتے ہیں۔ اسکے ساتھ کلرکوں کو ہدایت کرنا ہے کہ جو فارم پبلک کے پاس بھیجے جاتے ہیں ان کے مضامین کی ایک ہی زبان عام فہم ہندوستانی ہو مگر انمیں سے ایک کا رسم خط اردو میں اور دوسرے کا ہندی میں ہو۔ دیکھنا ہے کہ یہ چھوٹا سا کام حکومت سے کب تک انجام پاجاتا ہے ——— ابھی حال میں "حقیقت اور افسانہ" کے نام سے حکومت کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع کیا گیا ہے۔ یہ پیر پور کمیٹی کی رپورٹ کے جواب میں ہے۔ اس میں "حکومت بہار اور زبان" کے عنوان سے بھی ایک مختصر گفتگو ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس گفتگو سے مطمئن نہیں ہوئے۔ یہ بیان بے بنیاد استدلالوں پر قائم ہے۔ لیکن حکومت کی جانب سے اس مذکورہ بالا مکتوب کے موصول ہو جانے کے باعث ابھی ہم اسپر کوئی گفتگو کرنے سے محترز رہتے ہیں کہ شاید یہ مطبوعہ پمفلٹ اس مکتوب سے پہلے لکھا گیا ہو۔ اور حکومت کی توجہ رفع ضرورت اور اصلاح حال کی جانب مبذول کرائی جارہی ہو۔

ہمارے صوبہ میں واردھا اسکیم کے مطابق تعلیمی سلسلہ کا آغاز ہونیوالا ہے۔ آنریبل ڈاکٹر سید محمود شیوگاؤں گئے تھے "تاکہ گاندھی جی سے اس مسئلہ پر مزید گفتگو کریں۔" توقع ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے اس وعدہ کو فراموش نہیں کیا ہوگا جو اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کے لازم کئے جانے کے متعلق وہ کرچکے ہیں۔ یہ بات ذکر کے لائق ہے کہ ہمارے صوبہ میں آج سے چند سال پہلے آنریبل سر سید فخر الدین کی وزارت کے زمانہ میں مسلمانوں کیلئے انگریزی اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے انتظام کئے جانے کی منظوری حکومت کی طرف سے دیجا چکی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسپر ابھی تک عملدرآمد نہ ہوسکا ہے۔ ضرورت ہے کہ آنریبل موصوف اس فیصلہ کو نفاذ میں لاکر مسلمانوں کی یہ اہم ضرورت پوری کریں

مکہ معظمہ میں مدرسہ فخریہ مفید دینی و تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس مدرسہ کے ناظر مولانا انصاری محمد اسحق ندیم کے ذریعہ ان ہندوستانی محسنوں کی خدمت میں شکریہ پیش کرتے ہیں جنھوں نے حج کے موقع پر اس مدرسہ کو اپنے عطیوں سے نوازا۔ دعا ہے کہ خداوند تعالی اس مدرسہ سے سرزمین حجاز میں علم دین کی روشنی پھیلائے۔ اور اس کے محسنوں کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

مقالات

سراج ہندی

ہندوستان کا ایک گمنام مشہور عالم جس نے عالمِ اسلامی میں نام پیدا کیا

از سید ریاست علی ندوی

(یہ مقالہ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔)

(۱)

"سراج ہندی" ہندوستان کے اون چند مشہور علماء میں ہیں۔ جو اگرچہ اپنے وطن میں گمنام رہے لیکن دیگر بلاد اسلامی میں آفتاب علم بن کر چمکے اور اپنے علم کی روشنی سے اسلامی دنیا کو روشن کیا۔ وہ اپنے عہد کی سب سے بڑی عدالتگاہ کے صدرنشین تھے۔ ان کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے صاحب کمال ارباب علم، استاذِ وقت بنکر اوٹھے، اور وہ بھی قاضی القضاۃ کے عہدے پر سرفراز کئے گئے۔ پھر ان کی وفات کے بعد بھی ان کی تصنیفات سے علم دین کا چراغ روشن رہا۔ اور ان کے بعد کے آنے والے علمائے امت نے ان کی کتابوں سے دین و مذہب کے مسائل و مباحث سمجھنے سمجھانے میں اون پر اعتماد کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کہتے ہیں۔

"وہ اصول فقہ و حدیث، منطق، تصوف اور علم اخلاق کے ماہر تھے[۱]"

سلیمان بن محمود کفوی اعلام الاخیار میں لکھتا ہے :-

"وہ امام تھے، علامہ تھے، صاحب نظر تھے، میدان مناظرہ کے شہسوار تھے۔ بڑے ذہین اور بے مثل تھے[۲]۔"

---

[۱] الدرر الکامنہ ج ۳ - ص ۱۵۴ مطبوعہ سنہ ... [۲] الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ص ۶۰ مطبوعہ سنہ ۱۲۹۳ھ

ماخذ

مجھے "قاضی القضاۃ سراج الدین الہندی" نام پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۲۹ء میں ابوالعباس احمد قلقشندی متوفی سنہ ۸۲۱ھ کی مشہور کتاب صبح الاعشیٰ کے اوس حصہ میں نظر آیا، جس میں اوس نے ہندوستان کے تمدنی و معاشرتی حالات مفصل بیان کئے ہیں۔ اوس میں ایک سے زیادہ مقام پر یہ مذکور تھا۔

وذکر فی مسالک الابصار عن قاضی القضاۃ سراج الدین الھندی...	مسالک الابصار میں قاضی القضاۃ سراج الدین ہندی سے مذکور ہے .....

پھر آگے چل کر اس سے زیادہ یہ تصریح ملی کہ

وقد ذکر فی مسالک الابصار اسعار الھند فی زمانہ نقلاً عن قاضی القضاۃ سراج الدین الھندی وغیرہٖ	مسالک الابصار میں قاضی القضاۃ سراج الدین الہندی وغیرہ کی روایت سے ہندوستان کے نرخ کا جو اون کے زمانہ میں تھا ذکر کیا ہے۔

قاضی القضاۃ سراج الدین ہندی کے صاحب مسالک الابصار ابن فضل اللہ عمری متوفی سنہ ۷۴۹ھ کے ہمعصر ہونے سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ بھی اسی آٹھویں صدی میں گذرے ہیں۔ اور پھر منصب "قاضی القضاۃ" سے خیال گذرا کہ شاید وہ اس عہد میں ہندوستان کے عہدۂ صدر جہانی پر سرفراز ہوں۔ اور حج و سیاحت ممالک اسلامی کی تقریب سے ابن فضل اللہ اور سراج الدین کی ملاقات حجاز و شام میں ہوئی ہو۔ چنانچہ قلقشندی کے اوس حصے جس میں ہندوستان کا ذکر آیا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ایک مضمون "ہندوستان آٹھویں صدی ہجری میں" مرتب کرتے ہوئے میں نے لکھا:۔

"اس لئے قدرتی طور پر ہندوستان کے ان حالات کے متعلق قلقشندی کے دو ماخذ ہیں۔ ایک عرب سیاحوں کے جغرافیہ کی کتابیں اور دوسرے ہندوستان کے بعض ایسے اہل علم کے بیانات جو ان ممالک ..." [1]

لیکن بعد میں یہ بہ تحقیق معلوم ہوا کہ اس عہد میں قاضی القضاۃ کے منصب پر سراج الدین نام کا کوئی شخص مامور نہ تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد جلال الدین سیوطی متوفی سنہ ۹۱۱ھ کی حسن المحاضرہ میں "السراج الہندی" نام نظر آیا۔ اور اس وقت یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں جس قاضی القضاۃ کا ذکر مسالک الابصار کے حوالہ سے کیا ہے وہ یہی سراج ہندی ہے۔ اور یہ ہندوستانی عالم سلطنت مصر میں سلطنت کے ایک بلند منصب پر فائز ہے لیکن افسوس کہ حسن المحاضرہ میں محض ان کے قاضی و فقیہ ہونے کی حیثیت سے ان کا سرسری تعارف کرایا گیا تھا۔ اس سے یہ عقدہ حل ہو جانے کے باوجود کہ وہ خلفائے عباسیہ مصر کی سیادت اور سلاطین ممالیک بحریہ مصر کی سلطنت میں ایک بلند منصب پر فائز

[1] معارف ج ۲۶ بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء ص ۴۰۶

تھے۔ پھر بھی ان کے سوانح و فضائل علمی پر تاریکی کے پردے پڑے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۵۲ھ میں ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی الدرر الکامنہ شائع ہوئی۔ اور ابن عماد حنبلی متوفی ۱۰۸۹ھ کی شذرات الذہب مطبوعہ مصر ۱۳۵۰ھ نظر سے گذری اور پھر مجھے مراجعہ کتب سے یہ مجموعی طور پر معلوم ہوسکا کہ ابن حجر عسقلانی، ابن عماد حنبلی، محمود بن سلیمان کفوی، اور ملا علی قاری وغیرہ نے اس شخصیت کے پر عظمت چہرے سے نقاب اٹھائی ہے۔ پھر حسن اتفاق کہ اس اثنا میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کو بھوپال کے کتب خانۂ امیریہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس میں ابن کمال پاشا متوفی ۹۴۰ھ کی طبقات الحنفیہ کا ایک قلمی نسخہ نظر سے گذرا۔ اور اس میں بھی سراج الدین ہندی کا تذکرہ موجود ملا۔ جسے حضرۃ الاستاذ موصوف نے اپنی بیاض میں نقل فرمایا۔ نیز اصول فقہ و عقائد کی کتابوں میں مختلف علمی و مذہبی مباحث کے ذیل میں "الشیخ العلامہ سراج الدین الہندی" کے حوالے اور اقتباسات نظر آئے۔ اسی طرح مفتاح السعادۃ (طاش کبرہ زادہ متوفی ۹۶۸ھ) کشف الظنون (حاجی خلیفہ متوفی ۱۰۶۷ھ)۔ اور بعض کتب خانوں کی فہرستوں سے ان کی تصنیفات کا سراغ لگا۔ ابن حجر نے رفع الاصر عن قضاۃ مصر میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اتفاق وقت کہ وہ ان اوراق کی تسوید کے وقت میرے سامنے موجود نہیں۔

سراج ہندی اور ہندوستان کی تاریخیں

مذکورۂ بالا ماخذوں کی تصریح سے یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ سراج الدین ہندی کے جو کچھ حالات معلوم ہوسکے ہیں۔ وہ غیروں ہی کی زبانی ہیں۔ خود اس ملک کی تاریخ میں جہاں وہ پیدا ہوا، تعلیم و تربیت پائی، علوم کی تحصیل سے فارغ ہوا۔ اور جہاں اپنی زندگی کے ۲۴، ۲۵ سال گذار دیئے، وہاں کے فضلاء و ارباب کمال کے تذکرہ نگار ضیاء الدین برنی اور میر غلام علی آزاد وغیرہ اس کے ذکر سے خاموش ہیں۔ صرف محمود بن سلیمان کفوی کی اعلام الاخیار کی تلخیص الفوائد البہیہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی میں "عمر بن اسحق" نام سے اور اسی سے ماخوذ تذکرۂ علمائے ہند اور مفتاح السعادہ اور الفوائد البہیہ سے ماخوذ نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحی میں "عمر غزنوی" اور "عمر بن اسحق غزنوی" کے عنوانوں سے ان کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے۔ اور جن میں سیوطی کا مجمل بیان بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ اور کشف الظنون کا اجمالی ذکر آیا ہے۔

ہمیں قاضی سراج الدین ہندی کے حالات اب تک جو کچھ معلوم ہوسکے اور خصوصاً ان کی تصنیفات کا سراغ جس حد تک لگایا جاسکا وہ پیش خدمت ہے۔

نام و نسب و وطن

عمر نام، والد کا نام اسحق، اور دادا کا احمد ہے۔ ابو حفص کنیت اور سراج الدین لقب تھا۔ ہندوستان میں ان کے آبا و اجداد غزنہ سے آئے تھے۔ اس نسبت سے غزنوی کہلائے۔ پھر اپنے لقب اور ہندوستان کے انتساب سے "سراج ہندی" مشہور ہوئے۔

پیدائش وتعلیم تربیت ۔ ۶۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ سال ولادت خود انہی کی ایک تحریری شہادت سے مروی ہے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت کے بعد اس عہد کے ممتاز علمائے ہند سے دہلی میں علوم کی تحصیل سے فارغ ہوئے[1]۔

اس عہد میں دہلی کی تعلیمی فضا ۔ سراج ہندی جس زمانہ میں دہلی میں علوم کی تحصیل میں مصروف تھے، یہ مقام علم وفضل کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس عہد کے ایک اہل علم شیخ مبارک بن محمود انباتی (کھمبایتی) کے بیان کے مطابق ان دنوں یہاں ایک ہزار مدرسے قائم تھے[2]۔ ضیاء الدین برنی اور فرشتہ نے اس عہد کے دہلی کے ایسے بکثرت اساتذہ کے نام گنائے ہیں جو باکمال فضلاء میں تھے اور جن کے وجود سے علم دین کا چراغ روشن تھا[3]۔

اساتذہ ۔ ان افاضل روزگار میں سے امام وجیہ الدین رازی دہلوی، علامہ شمس الدین خطیب دہلی، ملک العلماء سراج الدین ثقفی، اور شیخ رکن الدین بدایونی، قاضی سراج الدین ہندی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کا تذکرہ خود سراج نے مصر کے اہل علم سے کیا ہے۔ اور جنھوں نے ان لوگوں کو اپنی تصنیفات میں اسی حیثیت سے روشناس کیا ہے۔ ان شیوخ کی مسند درس دہلی میں بچھی ہوئی تھی۔ اور یہ سب کے سب فقہ حنفی میں اپنے وقت کے استاذ مانے جاتے تھے[5]۔

مولانا وجیہ الدین رازی دہلوی کا تذکرہ ضیاء الدین برنی نے بھی علائی عہد کے ان فضلائے روزگار میں جو درس و تدریس سے فیض عام جاری کئے تھے کیا ہے۔ (فیروز شاہی ص ۳۵۲) اور سیر الاولیاء میں انہی کا ذکر وجیہ الدین پائلی کے نام سے ملتا ہے۔ یہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ عرب مورخین نے ان کے علم وفضل کا اعتراف "امام، ملک العلماء، بلد دہلی" کے خطاب سے اور ان کے زہد وتصوف کا "زاہد" کے لقب سے کیا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد رے سے ہندوستان آئے، اس نسبت سے رازی کہلائے، اور ہندوستان میں یہ خاندان اسی مردم خیز صوبہ پنجاب کے ایک قصبہ پائل (مرکز ریاست پٹیالہ) کا باشندہ تھا اس نسبت سے پائلی اور عربی میں "البائلی" مشہور ہوئے پھر دہلی میں یہاں ان کے حلقۂ درس کے قائم ہونے کی وجہ سے دہلوی کہلائے۔ الجواہر المضیئہ میں نسبت "البائلی" کے ذیل میں ہے

"یہ امام زاہد وجیہ الدین ہیں۔ جو شہر دہلی بلاد ہند کے آئمہ میں سے ہیں۔ ہمارے رفیق اور استاد علامہ

---

[1] الدرر الکامنۃ ابن حجر ج ۳ ص ۱۵۴ مطبوعہ دائرۃ المعارف ۱۳۵۰ھ، شذرات الذہب ابن عماد ج ۶ ص ۲۲۸ مطبوعہ ۱۳۵۱ھ مصر، طبقات الحنفیہ ابن کمال پاشا نسخہ قلمی موزکتب خانہ امیریہ بھوپال [2] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۶۹ طبع مصر [3] تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۳۵۲ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۶۲ء وتاریخ فرشتہ ج ۱ مقالہ دوم ص ۱۲۱ مطبوعہ نولکشور [5] الجواہر المضیئہ ج ۲ ص ۲۰۹، ۳۰۷ وغیرہ وشذرات الذہب ج ۶ ص ۲۲۸ والدرر الکامنۃ ج ۳ ص ۱۵۴۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ص ۹۰ مطبوعہ ۱۲۹۳ھ

سراج الدین عمر بن اسحٰق نے ان سے فقہ پڑھی اور ان کی تعریف کی ہے۔ وجیہ الدین کے استاذ نوسوخی ہیں، اور نوسوخی نے حمید الدین ضریر سے اور انھوں نے کردری سے فقہ پڑھی اور کردری صاحب ہدایہ کے تلمیذ تھے۔ رحمہم اللہ (ج ۲ ص ۲۸۶)

اسی طرح "الرازی" کے ذیل میں ہے:۔

"اسی طرح ہندوستان کے ملک العلما وجیہ الدین منسوب ہیں۔ سراج الدین عمر بن اسحٰق نے ان سے فقہ پڑھی اور وہ امام علامہ شرف الدین تونخی کے شاگرد تھے۔ اور تونخی نے امام حمید الدین ضریر بخاری سے اور انھوں نے کردری سے فقہ پڑھی اور کردری صاحب ہدایہ کے شاگرد تھے۔" (ر ص ۳۰۹)

پھر ان کا تذکرہ اساتذہ و شاگرد سے متعلق بعینہٖ انہی تصریحات کے ساتھ شیخ عبد اللہ بن عبد الباقی نقشبندی دہلوی کی طبقات الحسامیہ میں آیا ہے۔ علامہ شمس الدین خطیب دولی اور ملک العلما، سراج الدین ثقفی کا تذکرہ بھی صاحب جواہر المضیہ نے سراج الدین کے اساتذہ ہی کی حیثیت سے کیا ہے۔ یہ دونوں بھی شیخ ابو القاسم تونخی کے دامن فیض کے تربیت یافتہ تھے۔ اور جیسا کہ گذرا تونخی حمید الدین ضریر اور کردری کے واسطوں سے صاحب ہدایہ کے تلمیذ تھے۔ (ر ص ۳۰۰ الفوائد البہیہ ص ۶۰ والدالکامنہ وشذرات الذہب وغیرہ)

---

[1] مولانا سید عبد الحی صاحب نزہۃ الخواطر نے "وجیہ الدین پائلی" و "وجیہ الدین رازی" دو انتسابوں سے دو جداگانہ شخصیتیں تسلیم کی ہیں۔ "رازی" کے انتساب سے انھوں نے "الفوائد البہیہ" سے نقل کیا ہے اور "پائلی" کی نسبت سے سیر الاولیا سے۔ موصوف مرحوم کو ان دونوں کے ایک شخصیت ہونے کا شبہہ شیخ عبد اللہ بن عبد الباقی نقشبندی دہلوی کی الطبقات الحسامیہ کی اس عبارت سے ہوا۔ جس میں ان کے شیخ کے سلسلہ تلمذ اور تلمیذ سراج کا ذکر آیا ہے۔ لیکن موصوف مرحوم نے حاشیہ میں یہ لکھ کر اس شبہہ کو قبول نہیں فرمایا۔

"صاحب کتاب نے کسی مستند کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اسلئے یہ مجھے اشتباہ ہو گیا کہ پائلی اور رازی دونوں دو شخص ہیں یا صرف ایک، لیکن میرا گمان ہے کہ یہ دونوں دو شخص ہیں۔ واللہ اعلم۔ عبد الحی" (نزہۃ الخواطر ص ۱۷۶، ۱۷۸)

مگر الجواہر المضیہ میں "الرازی" کے ذیل میں جو کچھ ہے اس سے طبقات حسامیہ کی عبارت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لئے موصوف نے جس بنیاد پر اس شبہہ کو دور کر دیا تھا۔ وہ قائم نہیں رہی۔ علاوہ ازیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا عرب مورخین (ابن ابی الوفا، ابن عماد، سیوطی وغیرہ) کے امام وزاہد کے انتساب سے ان دونوں نسبتوں کے ایک ہی وجیہ الدین کے متعلق ہونے کا ثبوت ملتا ہے، پھر سراج ہی کی روایت سے جواہر مضیہ میں ان کے اساتذہ کا ذکر آیا ہے۔ اگر دونوں دو ہوتے تو اس کی تصریح ملتی۔ چنانچہ ابن حجر، ابن عماد، کفوی، سیوطی اور ابن کمال پاشا نے جہاں ان کے اساتذہ کا ذکر کیا ہے ان میں صرف وجیہ الدین رازی لکھا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وجیہ الدین کی نسبت رازی زیادہ مشہور ہے۔ اور بعضوں نے دہلوی بھی لکھا ہے۔ سراج کے حالات میں "پائلی" کی نسبت سے کسی جگہ ان کا شاگرد ہونا مذکور نہیں۔ صرف الجواہر المضیہ میں پائلی کی نسبت کی تشریح میں ان کا تذکرہ کر دیا گیا ہے اور اسی ذیل میں سراج کی شاگردی کا ذکر بھی ہے ما بعد طبقات حسامیہ میں پائلی ہی کی نسبت کے ساتھ وجیہ الدین کا نام لکھا گیا ہے۔ وجوہ بالا سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ رازی اور پائلی دونوں نسبتیں ایک ہی وجیہ الدین کی ہیں۔ اسی مناسبت سے میں نے قدیم خاندانی وطن کے لحاظ سے "رازی" ہندوستانی وطن کی حیثیت سے "پائلی" اور جائے اقامت کے لحاظ سے "دہلوی" یہ تینوں نسبتیں قبول کر لیں۔

مولانا سید رکن الدین بدایونی بدایوں کے ایک ذی علم و معزز خاندان کے رکن تھے۔ ان کا تذکرہ عرب مورخین کے علاوہ ضیاء الدین برنی اور فرشتہ نے بھی کیا ہے۔ وہ شیخ الاسلام سید قطب الدین کے پوتے اور سید السادات سید تاج الدین کے برادر زادہ تھے۔ ان کے صاحبزادے سید قطب الدین اور پوتے سید اعزالدین بدایوں او راودھ کے قضاۃ میں سے گذرے ہیں۔ ضیاء الدین برنی سید رکن الدین کا بڑے احترام سے نام لیتا ہے۔ وہ پہلے دہلی میں اپنے درس و تدریس سے فیض عام جاری کئے تھے۔ پھر کڑے کے عہدۂ قضا پر سرفراز ہوئے۔ برنی انکی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور انہیں مرجع خاص و عام بتایا یہ لکھتا ہے:-

وسید رکن الدین برادرزادہ سید تاج الدین مذکور قاضی کڑہ بودہ است و باری تعالی سید رکن الدین را جامع فضائل آفریدہ بود و کشف و کرامات آراستہ و ہم صاحب سماع بود و ہم وجدی و حالتی عجیب داشت و روزگار بزرگی او در زہد و تجرید و ورع و اطاعت و ایثار کرانہ شدہ است و مولف تاریخ فیروز شاہی سعادت ملاقات سید تاج الدین و سید رکن الدین رحمہما اللہ دریافتہ است و شرائط پابوس ایشاں بجا آوردہ و من شمہ ای سادات بزرگوار و اوصاف ستودۂ مشتمی کہ دادہ خدا ایشاں داشتند بکتہ دیدہ است سیادت ہمہ آثار است و فرزندی رسول رب العالمین بہ شرف و بزرگی و منقبت و جلالت است کہ اگر خواہم کہ در محامد آں سادات و سائر سادات کہ نور دیدگان مصطفیٰ و جگر گوشگان مرتضیٰ بودہ اند و ہستند چیزی بنویسم سراسیمہ شوم و بعجز خویش معترف میگردم۔

نیز صاحب جواہر المضیۃ "البداؤنی" کے ذیل میں لکھتا ہے:-

"وہ امام علامہ رکن الدین بن سراج الدین عمر ہیں جنہوں نے اپنے ملک (ہندوستان) میں ان سے فقہ پڑھی اور انکی ستایش کی ہے۔ اور رکن الدین نے نسوی سے فقہ پڑھی ہے۔ اور وہ حمید الدین ضریر کے شاگرد تھے۔ کردری کے واسطے سے صاحب ہدایہ کے تلمیذ ہیں۔"

سفر حج تحصیل علم حدیث و سماع عوارف المعارف سراج الدین نے تقریباً ۲۴، ۲۵ سال کی عمر میں تقریب حج کے موقع سے ہندوستان کے باہر قدم نکالا۔ اور ادائے حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ مکہ معظمہ میں علم حدیث کی روایت و سماع کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ نیز مولانا وجیہ الدین پائلی کے دامن فیض میں تربیت پانے سے تصوف کا مذاق پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں شیخ شہاب الدین عمر بن محمد بن عبداللہ سہروردی متوفی ۶۳۲ھ کی کتاب عوارف المعارف کو شیخ خضر سے جو رباط شذرہ کے شیخ تھے سنا۔ نیز اسکی روایت قطب قسطلانی متوفی ۶۸۶ھ کی جنہوں نے اوسکو خود شیخ شہاب الدین سہروردی سے سنی تھی۔ (باقی آئندہ)

سلہ تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی ص ۳۴۹ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۶۲ء و تاریخ فرشتہ ج ۱ مقالہ دوم ص ۱۲۱ مطبع نولکشور۔

علمِ طب اور مسلمان

از جناب نبی احمد صاحب اصلاحی، سرائے میر، اعظم گڈھ

شریعت اسلامیہ اور طب

اسلام نے ابتدا ہی سے علم طب کے متعلق وہ فیاض رویہ اختیار کیا جس کی نظیر دوسرے قدیم مذاہب میں نہیں مل سکتی۔ داعی اسلام علیہ السلام نے مبعوث ہونے کے بعد اپنے پیرؤوں کو بار ہا مرض کا علاج کرانے اور طبیب سے مشورہ لینے کی ترغیب دی۔ آنحضرت صلعم سے متعدد حدیثیں اس قسم کی مروی ہیں جن میں سے بعض تو مرض کے علاج کے استحباب اور بعض اس کے وجوب پر بھی دلالت کرتی ہیں مثلاً آپنے فرمایا ہے کہ:۔

"ہر مرض کی کوئی نہ کوئی دوا ہے جب دوا مل جائے تو مرض خدا کے حکم سے ضرور اچھا ہو جائے گا" (مسلم)

"اے خدا کے بندو! علاج کرو کیونکہ سوائے بڑھاپے کے خدا نے کوئی ایسا مرض پیدا نہیں کیا جس کی دوا نہ ہو"۔ (ترمذی)

اسلام نے اپنے مذہبی امور کے ضمن میں بھی طب کی ہر طرح سے قدر و منزلت قائم رکھی۔ اس نے عبادت کے متعدد ارکان، جو اس کے نزدیک فرض عین تھے۔ تدبیر صحت کے اصولوں کا خیال کر کے ضرورت کے موقعہ پر ساقط کر دئے۔ تدبیر صحت کے اصول فی الجملہ تین ہی ہیں، حفظان صحت، مادۂ فاسد کا نکالنا اور پرہیز کرنا۔

حفظان صحت کا خیال کر کے اسلام نے مسافر سے فرض روزے ساقط کر دئے کیونکہ سفر میں تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے اور کھانے پینے کا معقول انتظام نہیں ہوتا۔ مسافر اگر اپنا روزہ قائم رکھے گا، تو اس کی صحت میں خلل آنے اور آیندہ اس کے بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ استفراغ موادِ فاسدہ کی رعایت کی مثال اس کا وہ مشہور مسئلہ ہے جس کی بنا پر حج میں احرام باندھنے والے کے لئے یوں تو بالعموم سر منڈانا ناجائز ہے لیکن اگر سر میں کسی قسم کی شکایت یا مرض ہو جس کی بنا پر ردی بخارات کا خارج ہونا ضروری ہو تو اسوقت سر منڈانا جائز ہے۔ اس طرح اصول پرہیز کی رعایت کرتے ہوئے اسلام نے مریض کو اسوقت، جبکہ پانی کے استعمال سے ضرر کا اندیشہ ہو، اس امر کی اجازت دی کہ وہ بجائے وضو کے تیمم کر سکتا ہے۔

طبیب سے مشورہ کرنے کی بھی داعی اسلام نے بہت تاکید کی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ایک مریض کی

عیادت کے واسطے تشریف لے گئے اور فرمایا "کسی طبیب کو بلاؤ"۔ ایک شخص نے تعجب سے پوچھا کیا آپ کی بھی یہی رائے ہے؟ آپ نے فرمایا یقیناً کیونکہ خدا نے جس مرض کو پیدا کیا اس کے لئے کوئی نہ کوئی دوا بھی پیدا کی ہے"۔ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۹۹)

اسی باب میں داعی اسلام نے اس پر بھی زیادہ زور دیا ہے کہ جس طبیب سے بیماری کے متعلق مشورہ لیا جائے وہ حتی الامکان اپنے فن میں ماہر ہو۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں ایک شخص زخمی ہوگیا اور اس کے زخم سے بہت زیادہ خون نکلنے لگا۔ اس شخص نے اپنے علاج کے لئے دو آدمی بلا بھیجے۔ آنحضرت نے ان سے پوچھا تم دونوں میں زیادہ ہوشیار طبیب کون ہے؟ (جو زیادہ ہوشیار ہو وہی مرہم پٹی کرے)۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (موطا امام مالک) ایک دوسری حدیث میں آنحضرت کا یہ قول مروی ہے "جو شخص طبیب کی حیثیت نہ رکھتا ہو اور علاج کرے تو اسے اپنی فاش غلطی کا تاوان دینا پڑیگا"۔ (ابوداؤد و ابن ماجہ) یہ حدیث صاف صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ داعی اسلام نے صرف تعلیم یافتہ طبیبوں کو علاج کرنے کی اجازت دی ہے اور یہ کہ حتی الامکان اس طبیب سے علاج کرانا چاہئے۔ جو طب میں کافی تجربہ رکھتا ہو۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کو مسلم و غیر مسلم دونوں قسم کے اطبا سے مشورہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ خود پیغمبر اسلام علیہ السلام نے کئی مرتبہ اپنے اور بعض صحابہ کے علاج کے واسطے حارث بن کلدہ کو بلا بھیجا۔ حالانکہ یہ طبیب اخیر تک مشرف باسلام نہ ہوا۔ متعدد حدیثوں میں اس کے علاج کا تذکرہ موجود ہے۔ یقیناً آنحضرت کا یہی فعل تھا۔ جس نے زمانہ مابعد میں خلفائے بنی امیہ کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنے دربار میں عیسائی اور یہودی اطبا کو جگہ دیں۔ اور پھر بنو عباس نے ہندوستان کے طبیبوں کو دارالخلافہ میں بلا بھیجا۔

طب نبوی اور اسکی حقیقت

حدیث کی کتابوں میں محدثین نے "طب النبی صلعم" کا ایک عنوان بھی قائم کرکے آنحضرت کے بہت سے طبی ارشادات نقل کئے ہیں۔ ان ارشادات میں متعدد دواؤں کے ساتھ ساتھ قدرے جراحی کا بھی ذکر موجود ہے۔ دوائیں زیادہ تر از قسم مفردات ہیں۔ بعض بعض جگہ دو دو چیزوں کے مرکب کے استعمال کی ہدایت کی گئی ہے۔ محدثین کا خیال ہے کہ اس قسم کی تمام حدیثوں میں جن طبی امور کا اظہار کیا گیا ہے، وہ فی الحقیقت الہامات خداوندی ہیں جو آنحضرت کی جانب القا کئے گئے۔ وہ یقیناً صحیح اور قطعی ہیں اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے' ابن قیم جوزی فرماتے ہیں۔

"آنحضرت کا طب اطباء کے طب کی مثل نہیں ہے کیونکہ آنحضرت کا طب تو یقینی، قطعی اور خداوندی ہے اور اس کا صدور وحی، نور نبوت اور کمال عقل سے ہوا ہے، بخلاف اس کے اطبا کا طب زیادہ تر تجربات اور ظنی اشیاء

پوشیدہ ہے۔ اگر بہت سے مریضوں کو طب نبوی سے فائدہ نہیں ہوتا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ فائدہ اسی کو ہوسکتا ہے جو اسے کامل اعتقاد اور ایمان کے ساتھ استعمال کرے۔ اسکی مثال بعینہٖ قرآن مجید کی سی ہے جس کے متعلق خدا "فیہ شفاء لما فی الصدور" کی صفت استعمال کرتا ہے حالانکہ یہی قرآن مجید شافی ہونے کے باوجود منافقین کے مرض کو اور بھی زیادہ کرتا ہے (جسکی وجہ محرومیت اعتقاد کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں)

(زاد المعاد جلد ۲ ص ۶۹)

نووی نے شرح مسلم میں اس قسم کی حدیثوں پر اعتراض کرنے والے اور ان میں شبہ کرنے والے کو "المعترض الملحد" کے لقب سے یاد کیا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان حدیثوں پر اعتقاد رکھنا مسلمان کے واسطے لابدی ہے۔

ہمارے خیال میں محدثین کو اس موقعہ پر بہت کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیثیں جاہلیت کے بادیہ نشیں عربوں کے طبی خیالات کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ دوائیوں اور جراحی کے شعبہ کا بیشتر حصہ پرانے بدوی عربوں کے خیالات سے ماخوذ ہے گو اس امر کا امکان ہے کہ ان مفرد دوائیوں سے بعض کو آنحضرت نے خود تجربہ کرکے تجویز کیا ہو۔ زمانہ قدیم سے جو کچھ بوڑھوں اور بوڑھیوں میں جو طب منقول ہوتا چلا آرہا تھا اسی کو آپ نے بطور استحباب یا اجازت بیان کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان طبی حدیثوں میں بہت سی ناقابل فہم باتیں بھی ہیں جو ان کے الہام و وحی ہونے کے بالکل منافی ہیں مثلاً:۔

بدہضمی اور پیچش کا علاج شہد تجویز کیا گیا ہے (صحیحین) حالانکہ صحیح تحقیق کے مطابق شہد خود مسہل شئے ہے پھر مرض اسہال کے لئے کیونکر مفید ہوسکتا ہے؟ اگر اس مریض کو جس کا اس حدیث میں ذکر ہے شہد سے فائدہ ہوگیا تو اس کے یقیناً دوسرے اسباب رہے ہونگے نہ کہ یہ مسہل شئے "شہد"۔ عہد جاہلیت میں شہد بطور مسہل کے استعمال ہونے کے علاوہ کبھی کبھی غلطی سے پیچش اور بدہضمی کے لئے بھی استعمال ہوتی رہی ہوگی لیکن طبی اصول سے اس کی غلطی ثابت ہوگئی ہے اور اس میں شہد کی گنجائش نہیں۔

بخار کا علاج ٹھنڈے پانی کا غسل بتایا گیا ہے (صحیحین) حالانکہ غسل اور بخار کے درمیان کوئی مناسبت نہیں[1]۔

---

[1] ندیم: مقالہ نگار نے آگے چل کر اس سلسلہ میں ابن خلدون کی رائے پیش کرکے جو کچھ لکھا ہے وہ اس مسئلہ میں بہت [illegible] لیکن اس سلسلہ میں [illegible] چاہئے کہ کسی مرض کا علاج اسکے اسباب اور متعلق کیفیتوں ان کی قدرتی احتیاجوں کے لحاظ سے کیا جاتا ہے جس کی صحیح [illegible] یا اطبا ہی کرسکتے ہیں [illegible] سال کی بات ہے [illegible] تھا۔ ۱۰۵ تک درجہ حرارت پہنچ چکا تھا۔ ڈاکٹر محمد عنایت اللہ صاحب ایم اے۔ بی۔ ایس [illegible] انگلینڈ [illegible] کے ساتھ مریض کے کمرے کی کھڑکیاں بند کرائیں۔ اس کے جسم کے سارے کپڑے اتار دئیے۔ اور ٹھنڈا پانی [illegible] دیکھا کہ انھوں نے خاص طبی طریق پر اس پر کو نہ صرف یہ کہ ٹھنڈے پانی سے غسل دیا بلکہ غسل کے بعد ایک بھیگی چادر پانی میں [illegible] اس کے سارے جسم کو لپیٹ کر لپیٹ دیا۔ بخار ایک سو پانچ سے ساڑھے چار پھر چادر اسی طرح بدلتا ہے صرف [illegible] ص ۱۰۰ درجہ تک [illegible] وہ چادر اس کے جسم سے اتار دی گئی اور دوسرے کپڑے پہنائے گئے۔ ——— (باقی صفحہ ۳۱۰ پر)

اسی طرح زہر کا حفظ ما تقدم یہ تجویز کیا گیا ہے کہ صبح کو سات خرمے کھالئے جائیں (صحیحین) بعض دوسری روایتوں میں زہر کی دوا بھی خواب بتائی گئی ہے (نسائی و ابن ماجہ) حالانکہ زہر اور خرمے میں طبی حیثیت سے کوئی مناسبت نہیں۔ چونکہ محدثین نے ان روایتوں کو بالکل وحی اور الہام تصور کر لیا تھا، اس بنا پر انہیں ان کے مفہوم کے صدق کے لئے بہت سی پیچدار تاویلیں کرنی پڑیں کبھی تو انھوں نے یہ کہدیا کہ یہ دوا آنحضرتؐ نے محض عرب یا بالخصوص اہل حجاز کے لئے تجویز کی تھی کبھی یہ کہ یہ دوا آنحضرتؐ نے فلاں مرض کی بعض مخصوص قسم کے لئے تجویز کی تھی۔ کبھی یہ کہ یونانیوں نے جو طبی اصول قائم کئے وہ محض اپنے ملک کے مزاج اور آب و ہوا کے لحاظ سے نہ کہ عرب یا دوسرے ملکوں کے حالات کے لحاظ سے۔ اور کبھی جب بالکل تاویل کی گنجائش نہ دیکھی تو انھوں نے یہ کہدیا کہ آنحضرتؐ نے اس بات کو کسی ایسے نکتہ کی بنا پر فرمایا ہے جہاں تک اطبا یونان کی نظر ہرگز نہیں پہونچی۔ وغیرہ وغیرہ

ہمارے نزدیک اس قسم کی تاویلوں کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ آپ نے محض ماحول کے طبی خیالات بطور استحباب یا اجازت بیان کرد ئے ہیں اور اس بنا پر وہ محض ظنی امور ہیں اور غیر صحیح ہونے کا احتمال رکھتے ہیں، آنحضرتؐ کی ذات والا پر کسی قسم کا حرف نہیں آسکتا، کیونکہ آپ نے خود ہی فرما دیا ہے کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" یعنی تم لوگ دنیاوی معاملات کو زیادہ جاننے والے ہو۔ اس اعلان سے اس قسم کے شبہات دور ہو جاتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:۔

و للبادیۃ من اھل العمران طب یبنونہ فی غالب الامر علی تجربۃ قاصرۃ علی بعض الاشخاص متوارثا عن مشایخ الحی وعجائزہ و ربما یصح منہ البعض الا انہ لیس علی قانون طبیعی و لا علی موافقۃ للمزاج و کان عند العرب من ھذا الطب کثیر و کان فیھم اطباء معروفون کالحارث بن کلدۃ و غیرہ والطب المنقول فی الشرعیات من ھذا القبیل ولیس من الوحی فی شئی و

عرب کے بادیہ نشینوں کے پاس ایکقسم کا طب تھا جس کی بنیاد ان لوگوں نے صرف چند اشخاص پر تجربہ کر کے ڈالی تھی اور وہ قبیلہ کے بوڑھے اور بوڑھیوں سے بطور وراثت منقول ہوتا چلا آتا تھا اس کا بعض حصہ کبھی کبھی صحیح ثابت ہو جاتا تھا، لیکن وہ کسی طبی قانون یا موافقت مزاج پر مبنی نہیں تھا، عربوں کے پاس اس قسم کا طب بہت تھا ان میں بہت سے مشہور اطبا بھی مثلاً حارث بن کلدہ وغیرہ گذرے ہیں، اور وہ طب جو شریعت میں منقول ہے، اسی قسم کا ہے

(بقیہ صفحہ ۳۰۹) جناب ڈاکٹر صاحب موصوف جس وقت یہ عمل طبی کر رہے تھے، اسوقت وہ حدیث نبوی مجھے باربار یاد آرہی تھی۔ اور اس کی صداقت کی حلاوت سے ایمان میں تازگی آرہی تھی۔ اسلئے مقالہ نگار کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ "غسل اور بخار میں کوئی مناسبت ہی نہیں"۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شفایاب ہونا اگر بقول مقالہ نگار محض معجزۂ نبوی ہوتا یا یہ طریقہ علاج بتانا عرب کے جاہلی دور کے طبی ذہنیت ہوتا تو اس بیسویں صدی کی ترقی کے دور میں انگلستان کا ایک ماہر تعلیم یافتہ عالم طب اس طریقہ علاج کو کیوں اختیار کرتا؟ اور اس سے مریض آدھ گھنٹہ کی اندر اندر اس قدر محسوس فائدہ کیوں ظاہر ہوتا۔ "ر"

اسناهم امم کان عادیاً للعرب
(مقدمہ عنوان "علم الطب")

اعاس کا کوئی جز بھی الہامی نہیں ہے، یہ محض ایک ایسی چیز ہے
جو عربوں کے درمیان معتاد و مروج تھی۔

اس کے بعد علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ:-

"آنحضرت محض اس لئے مبعوث ہوئے تھے کہ ہم کو شریعت بتلادیں نہ اس لئے کہ طب یا اس قسم کی دوسری معتاد و مروج اشیاء کھائیں۔"

بہرکیف اس "طب نبوی" کا بیشتر حصہ عرب میں پہلے سے متعارف تھا اور اس بنا پر ان طبی حدیثوں میں ایسی باتیں مل سکتی ہیں جو جاہل عربوں کے طبی تجربات ہوں، اگر کوئی شخص اہل جاہلیت کے طبی خیالات کے متعلق تحقیق کرنا چاہئے تو اُسے بہت سا مواد انھیں حدیثوں میں مل سکتا ہے۔

خلافت راشدہ کا طب

جہاں تک تاریخ کے صفحات ہماری رہبری کرسکتے ہیں، یہی پتہ چلتا ہے کہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں عرب کی طبی دنیا میں کسی نئی بات کا ظہور نہیں ہوا۔ امراض اور ان کے علاج کے متعلق وہی معلومات پائے جاتے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں یا تو بادیہ نشیں عربوں کو معلوم تھے یا جو ایک آدھ سیاح عربوں نے اجنبی اطباء کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر حاصل کئے تھے اور اپنے بعض ہم وطنوں کے درمیان پھیلا دئے تھے۔ خلافت راشدہ کے عہد میں مسلمانوں کی توجہ طب یا دوسرے علوم و فنون کی طرف مائل ہی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سامنے سب سے زیادہ اہم مسئلہ ان کی قومیت اور مذہب کا استحکام تھا اور یہ بدیہی ہے کہ ہر شخص پہلے پہل اپنے وجود کے استحکام و بقا کی فکر کرتا ہے، اس کے بعد ان خارجی امور کی طرف اس کی توجہ مبذول ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی قومیت اور مذہب جیسے جیسے جس قدر مستحکم ہوتی گئی، اسی قدر طب یا دوسرے لوازم تمدن کی ترقی میں انھوں نے حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کی بہ نسبت طب کا کہیں زیادہ چرچا بنو امیہ کے عہد میں ہوا اور اس سے کہیں زیادہ عہد بنی عباس میں ہوا۔

اگر خلافت راشدہ کے زمانہ میں عربوں نے خود علم طب کی خدمت نہیں کی تو دوسری متمدن قوموں کے طبی مدرسوں اور شفاخانوں سے کچھ تعرض بھی نہیں کیا۔ ایران کا طبی مرکز جندشاپور خلیفہ دوم کے عہد میں فتح ہوا، ممکن ہے کہ فاتح مسلمانوں کے ہاتھوں بعض ذاتی جائداد اور ملکیت کو نقصان پہونچا ہو لیکن علم دوست مسلمانوں نے جندشاپور کی طبی درسگاہیں اور شفاخانے بالکل اسی حالت پر قائم رہنے دئے جیسے وہ پہلے تھے، نہ ان کے کسی طبیب کو انکی ذات سے صدمہ پہونچا اور نہ اس جنگ کی بنا پر ان کے علمی شغل میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی۔

... کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق بعض غیر محتاط مورخین نے کچھ گل فشانی کی تھی۔ لیکن اس کی حقیقت علامہ شبلی نعمانی کے مقالہ "کتب خانۂ اسکندریہ" سے واضح ہو چکی ہے۔

عہد بنو امیہ کا طب

خلفائے راشدین کے بعد بنو امیہ کا زمانہ آیا۔ انھوں نے ان تمام عرب اطبا کو جو محض ناقص جاہلی طب سے بہرہ ور ہو کر مریضوں کا علاج کرتے تھے، مشغلۂ طبابت سے روک دیا اور صرف انہیں لوگوں کو اس کی اجازت دی جو فی الواقع اس میں کمال رکھتے تھے۔ چونکہ ایسے لوگ مسلمانوں میں نہیں تھے اس بنا پر عیسائی اور یہودی اطبا کا رسوخ ان کے دربار میں بہت زیادہ ہوا۔ حضرت معاویہ بن ابو سفیانؓ کا شاہی طبیب ایک عیسائی ابن اثال نامی تھا یہ اطبا جو لحاظ قومیت رومی تھے، یونانی طب میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ وہی تمام مسلمان امرا اور اکابر کا علاج کرنے لگے اور ان سے بعض مسلمانوں نے بھی علم طب سیکھا۔ فی الحقیقت مسلمان پہلے پہل بنو امیہ ہی کے زمانے میں یونانی طب کے اصولی مسائل سے آشنا ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ عہد عباسی میں علم طب کی جو خدمت اور ترقی ہوئی بنو امیہ کے زمانے میں اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں انجام پایا۔ باایں ہمہ بنو عباس کی متعدد طبی خدمتوں کی بنیاد بنو امیہ ہی کے زمانے میں پڑ چکی تھی جنھوں نے متعدد رومی (لاطینی) اور سریانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرایا۔ طبی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ان کے وقت میں شروع ہو چکا تھا۔ علاوہ بریں بنی امیہ کی سب سے بڑی مایہ ناز طبی خدمت یہ تھی کہ مسلمانوں میں پہلے پہل انہیں نے بیمارستان اور شفا خانہ کی بنیاد ڈالی۔ ابتدا میں ولید بن عبدالملک نے جذامیوں اور اندھوں کے ٹھہرانے کے لئے ایک بیمارستان بنوایا اور ان کے لئے وظیفے مقرر کئے۔ اگرچہ اس کی مصلحت اس وقت محض اس قدر تھی کہ جذامی ادھر ادھر نکل کر اپنا متعدی مرض نہ پھیلاویں اور اندھے در بدر مارے مارے نہ پھریں۔ تاہم اسی عمارت کے بعد آہستہ آہستہ بڑے بڑے شفا خانے بنے جن میں اطبا مریضوں کے علاج کے واسطے ملازم رکھے گئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس قسم کا مکمل شفا خانہ بھی بنو امیہ ہی کے عہد میں تیار ہو گیا تھا۔

عہد اموی کے غیر مسلم اطبا میں مندرجہ ذیل ہستیوں کی زیادہ شہرت ہوئی۔

(۱) موریانوس: یہ ایک رومی راہب تھا اور طب و کیمیا میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس کے شاگردوں میں خالد بن یزید کا نام زیادہ قابل الذکر ہے۔

(۲) اصطفانوس رومی: اس عیسائی طبیب نے خالد مذکور کے ایما سے متعدد طبی کتابوں کا لاطینی سے عربی میں ترجمہ کیا۔

(۳) ماسرجویہ بصری: اس یہودی طبیب کی مادری زبان سریانی تھی۔ خلافت مروان میں اسے پادری اہرون اسکندری کی مشہور طبی تصنیف کو سریانی سے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم ملا اس نے تعمیل کی۔ ایوب بن حکم کہتے ہیں کہ میں ایک بار اس طبیب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اتفاق سے ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرے معدہ میں روزانہ جانوروں کی سی اشتہا

پیدا ہو جاتی ہے اور اس وقت میری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے کچھ دیر کے بعد جب میں کچھ کھا پی لیتا ہوں تو یہ شکایت دور ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر سہ پہر سے مجھے وہی شکایت لاحق ہوتی ہے اور شام کو کھانے کے بعد پھر دور ہو جاتی ہے کوئی ایسی دوا دیجئے کہ یہ بیماری ایک ہی بار کے علاج میں ہمیشہ کے لئے دفع ہو جائے اور بار بار کھانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ ماسرجویہ نے کہا۔ برا ہو تیری اس ناہنجار بیماری کا جس کو اتنی تمیز نہ ہوئی کہ میں کس نااہل کے پاس جا رہی ہوں کاش وہ میرے بجائے میرے اور میرے بچوں کے پاس آئی ہوتی۔ ارے ناداں یہ انتہائی تندرستی ہے جس کے مستحق تجھ جیسے نااہل نہیں ہیں خدا سے دعا کرو کہ وہ زیادہ حقدار بندوں کو نصیب ہو۔

(۴) تھیوڈ تیودوکس اور تیودون خلافت مروان کے زمانے میں یہ دونوں رومی طبیب حجاج بن یوسف ثقفی کی خدمت میں رہتے تھے۔ ان میں سے اول الذکر نے متعدد تلامذہ کو طبی معلومات سے بہرہ ور کیا اور متعدد طبی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اس کے تلامذہ میں فرات بن شحنا تھا جس نے عباسی خلیفہ منصور کا زمانہ پایا زیادہ مشہور ہے۔

خلافت بنی امیہ کے مسلمان اطبا میں زیادہ قابل ذکر حسب ذیل تین شخص ہیں۔

(۱) خالد بن یزید (متوفی ۸۵ھ) یہ اپنے زمانہ میں قریش کیا بلکہ عرب کے تمام قبائل میں علم و فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا اس نے کیمیا اور طب موریانوس سے سیکھا اور ان دونوں علموں میں متعدد رسائل لکھے جو اس کی قابلیت کی شہادت ہیں۔ ایک طبی رسالہ میں اس نے اپنے استاد موریانوس کی صحبت اور اس کے سکھائے ہوئے طبی مسائل و حقائق کو بالتفصیل بیان کیا ہے موریانوس کے فیض صحبت کے متعلق اس نے بہت سے اشعار بھی کہے ہیں۔

(۲) احمد بن ابراہیم یہ ۱۰۱ھ میں خلیفہ یزید بن عبدالملک کا شاہی طبیب تھا۔ اس نے بقراط کی مختلف تصانیف سے کچھ مسائل انتخاب کئے اور انہیں ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیا جس کا نام اس نے "اصول الطب" رکھا۔ ایک دوسری کتاب بھی لکھی جس میں ان تمام جڑی بوٹیوں پر مفصل بحث کی جو علاج کے واسطے کام آتی ہیں۔

(۳) ابوبکر محمد بن سیرین بصری ان کا شمار اکابر علمائے اسلام میں ہے۔ ان کے باپ سیرین جو ایام میں تانبے کا کام کرتے تھے کسی ضرورت سے عین التمر آئے تو انہیں خالد بن ولید نے مع دوسرے چالیس آدمیوں کے گرفتار کیا۔ انس بن مالک نے انہیں بطور غلام مول لے لیا۔ انہوں نے بیس درہم بطور فدیہ دیا اور آزاد ہو گئے پھر انہوں نے ایک لونڈی صفیا سے نکاح کیا جس سے یہ محمد ۳۳ھ میں پیدا ہوئے، نوفل افندی نے انکو اطبا کی فہرست میں شامل کیا ہے (صناجۃ العرب ص ۲۴۰) لیکن انکو شہرت محض حدیث اور خوابوں کی تعبیر میں حاصل ہوئی۔ اس فن میں انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی جو زمانہ مابعد میں بہت زیادہ مقبول ہوئی، انکی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی۔

(باقی)

حضرت صغیر الہ آبادی مرحوم اور ان کا کلام

از جناب سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی ام-اے ایڈوکیٹ لکھنؤ

سید علی نام، صغیر تخلص متوطن رسول پور سوتی پرگنہ کرنی ضلع الہ آباد۔ نہایت پختہ مشق اور کامل فن شاعر تھے۔ فارسی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ عربی میں فقہ وغیرہ کی کتابوں تک پڑھے ہوئے تھے۔ ان کو پیش نمازی کا اجازہ بھی مل گیا تھا لیکن اپنے انتہائی تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ عربی میں بھی اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے ان کے خاندان میں جناب مولوی سید مہدی علی صاحب قبلہ پیش نماز و الد ماجد مجتہد العصر جناب سید امجد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کے برادر عینی تھے۔ عنفوان شباب میں لیلیٰ شاعری کا سودا سر میں سمایا اسوقت دلی اجڑ چکی تھی۔ لکھنؤ (جو اس وقت جملہ فنون وصنعت کا مرکز تھا) کی بوئے شہرت نے اپنی طرف کھینچا۔ یہ گرویدہ ہوکر لکھنؤ پہونچے اور مناسبت طبعی سے مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد ہوگئے۔ بہت دنوں تک انہیں کے زیر اصلاح رہکر اس فن کی تکمیل حاصل کرتے رہے۔ جب گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آئی۔ اور واجد علی شاہ جنت آرام گاہ اپنے تخت زرنگار سے اتارے گئے تو اہل کمال کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ انھوں نے بھی لکھنؤ ایسے شہر کا داغ فرقت اپنے سینہ پر رکھا اور کبیدہ خاطر ہوکر گھر واپس آئے۔ خدا رازق ہے۔ اہل کمال کی قدر کہاں نہیں ہوتی۔ ایک سال بعد نواب مقصود علی صاحب جگناؤں ضلع جون پور نے طلبی کا خط بھیج کر بلایا چنانچہ یہ وہیں جاکر ملازم ہوگئے۔ کتاب زبدۃ المعجزات (سوانح عمری چہاردہ معصومین علیہم السلام جس کا دوسرا نام ریاض النور بھی ہے) وہیں نظم کی ہے۔ اب میں انہیں کے واقعات اسی مثنوی سے لکھتا ہوں جو لطف سے خالی نہیں ہیں۔

"بیان کسور ب قدیر و ذکر نام و نسب مصنف حقیر یعنی سید علی صغیر و حال گردش تقدیر و سبب تالیف نسخہ بے نظیر و توصیف تقریظ دلپذیر و اختتام بر دعائے خیر معہ ساقی نامہ"

اس خیال سے کہ زحمت اطناب طبع ناظرین پر بار نہ ہو میں حمد۔ دعائے خیر۔ اور ساقی نامہ نہیں لکھتا صرف اس ٹکڑے سے

---

[1] مجتہد العصر جناب مولانا سید امجد حسین صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کی ہستی محتاج تعارف نہیں ہے۔ علم فقہ میں ان کے مقابلہ کا کوئی عالم ہندوستان میں نہیں تھا۔ دس سال عراق میں رہ کر تکمیل علوم فرماتے رہے۔ افسوس کہ ۹ اگست [illegible] کو سیار گلشن جناں ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

...ینت صفحۂ قرطاس کرتا ہوں جس میں احوال مصنف رقم ہے۔)

ایہا الناس اسمعوا ذالان — نظم کرتا ہوں حال خود ماکان[1]
میر سید علی بن محمود — مورد لطف حضرت معبود
متخلص بحبیب حال منیر — گل پروردۂ بہار دبیر
آں دبیریکہ منشی فلک است — گرچہ آدم بود ولے ملک است
مولد خاص موضع سونی — جائے اخلاص موضع سونی
ہے کراری کے متصل سونی — نزد اہل قلوب دل سونی
وسعت سونی کا آب زر سے اگر — ہو رقم تو بجا ہے پیش نظر
کیمیا اسکی خاک سے ہے گرد — رنگ روئے طلائے احمر زرد
ہے وہاں بود باش عالم دیں — باعث افتخار اہل زمیں
کیوں نہ روشن ہو ان سے ہر در و بام — کہ منور علی ہے ان کا نام
بحر منقول و منبع معقول — جامع جملہ فروع و اصول
سب سے علم و عمل میں ہیں ممتاز — واعظ و خطبہ خوان و پیش نماز
عبد طاعت گزار کاشف ضر — قائم اللیل و صائم الدہر
شاہ اقلیم شرع نیک نہاد — ان کا ڈنکا ہے تا الہ آباد
فرق بین کتابیت یعنی — تھے وہ لیکن برادر عینی
لے گئے مجھکو لکھنؤ ہمراہ — بہر تحصیل علم با صد جاہ
از رہ لطف دیکھ عقل سلیم — مایہ الاحتیاج کی تعلیم
پرورش ہر طرح سے فرمائی — الفت والدین دکھلائی
تھا جو وہ اقتباس نور عزیز — بن گیا مہر ذرۂ ناچیز
کی تھی ہر چند علم کی تحصیل — نہ ہوئی تھی مگر ابھی تکمیل
کہ بڑھا شوق شاعری دن رات — ہو گیا علم مورد آفات

[1] ماکان ۔ یعنی گزشتہ جیسے ماکان و مایکون بولتے ہیں یعنی حال گزشتہ کہتا ہوں ۱۲

ہو گیا جو مرثیہ گوئی　　نہ ہوا اس کے شغل تھا کوئی
ناگہاں منقلب ہوئی تقدیر　　متفرق ہوئے صغیر و کبیر
نہ بر آئی کوئی امید مراد　　ہو گیا شہر لکھنؤ برباد
سلطنت وہ رہی نہ وہ سلطاں　　نہ وہ گلشن نہ وہ گل خنداں
نہ سہارا قیام کا پایا　　ہو کے مجبور اپنے گھر آیا
بعد اک سال خطۂ علم و ہنر　　سوئے مقصد ہوا مرا رہبر
سیّد ذی نشان و والاشان　　چشمۂ جود و منبع احسان
خان برتر خطاب عالی جاہ　　جانشین جناب کرم اللہ
نام عالی کی آرزو ہو اگر　　وصل مقصود سے علی کو کر
عزت افزا ساکن کچھ گانوں　　یوں جدا کچھ سے جیسے دھوپ چھاؤں
یعنی اس قدرداں نے بلوایا　　مورد لطف خاص فرمایا
جب ہوئے عازم بہشت بریں　　دل ہوا زار رنج و غم سے حزیں
لیکن اچھوں کے اچھے ہوتے ہیں　　کاٹتے ہیں وہی جو بوتے ہیں
مسند آرائے عزت و جاہ و شرف　　ہیں مظفر علی جو ان کے خلف
پاک طینت سخی رئیس امیر　　نامور۔ عقلمند۔ خوش تدبیر
رحم فرما میرے مدام وہ ہیں　　آج تک باعث قیام وہ ہیں
خلف الصدق ان کے با عز و جاہ　　ہیں محمد یحییٰ حق آگاہ
ہیں حلیم و فہیم و دانشور　　بردبار و حلیق و فرخ فر
رات دن میرے حال خستہ پر　　ہیں عنایات ان کی شام و سحر
سبب نظم معجزات علی　　نظم کرتا ہوں تا رہے زندگی
سیّد پاک افضل الفضلاء　　عالم الدہر صاحب تقویٰ
تا عرب ان کے علم کی ہو دھوم　　اس زمانہ میں ہیں وہ بحر علوم
نام گلشن علی سخی (۱)　　فخر زہاد عزت مولانا

بیٹھے تھے ایک دن وہ اپنے گھر | اتفاقاً ہوا مرا بھی گزر
میری جانب کیا خطاب اکبار | کے ثنا خوانِ عترتِ اطہار
مدحِ آلِ نبی ہے شام و پگاہ | مرحبا۔ آفریں جزاک اللہ
نظم میں لے صفیر کر مرقوم | معجزاتِ چہاردہ معصوم
زندگانی میں غمگسار رہے | بعد مرنے کے یادگار رہے
حسبِ ارشاد واجب التعمیل | میں نے کی جان و دل سے سعی جزیل
دل پہ کیا کیا نہ حادثے گزرے | نہ تھے اسباب جمع خاطر کے
دورِ گردوں سے کو وہ غم ٹوٹا | نظم کا پر نہ سلسلہ چھوٹا
طول و اطناب سے نہ کام رکھا | زبدۃ المعجزات نام رکھا
اب تمنا یہ مومنوں سے ہے | آرزو پاک باطنوں سے ہے
اس ریاضِ جناں کی سیر کریں | میرے حق میں دعائے خیر کریں

مثنوی زبدۃ المعجزات ۲۹۰ صفحوں میں چھپ کر مطبع نور کانپور پریس سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب بالکل مفقود ہے۔ اس لئے نمونہ کے طور پر ایک معجزہ درج کرتا ہوں کہ شاعر کا فن کمال خاک کے نیچے نہ چھپا رہے۔ بلکہ اہل فن قدر کی نگاہوں سے دیکھیں۔ شاعر نے واقعات نظم کرنے کے پہلے اس امر کا التزام کیا ہے۔ کہ یا تو راوی کا نام لکھ دیا ہے۔ یا جس کتاب سے روایت کی ہے اس کا حوالہ دیدیا ہے۔

معجزہ تباہی اہل کوفہ باعثِ خشک سالی و فریادی شدن مردمان نزد شاہ مرداں و متوجہ شدن جناب امام حسین علیہ السلام بایمائے جناب ابوالحسن علیہ السلام و باریدن باراں بدعائے سبط رسول زماں در کتاب عیون المعجزات از مرتضیٰ علیہ الرحمۃ۔

سید مرتضیٰ فصیح زماں | لکھتے ہیں یہ حدیث راحت جاں
کہ زمانِ علی میں شیخ و شاب | خشک سالی سے سب ہوئے بیتاب
کوفیوں کو ہوئی پریشانی | نالہ و شور و اشک افشانی
ابر گردوں پہ ہو گیا نایاب | چھا گیا دودِ آہ دل کا سحاب

آب چشموں میں بہا چھپ گیا سارا — جوش دریائے اشک نے مارا

خشک تھا غیر آب روئے زمیں — تشنگاں بہائے تشنہ غمگیں

قطرۂ آب پیش خلق خدا — آبرو میں بہ از دُر یکتا

یہیں سے پیش مردم محزوں — قطرۂ اشک تھے دُرِ مکنون

ہوگیا خشک کشت زار تمام — قوت ناب ہوئی گمنام

سائل آب سب تھے زرع و نخیل — چرخ مسک مثال سنت بخیل

سبزہ بے آب زرد اور غلطاں — جیسے بے شیر کودک ناداں

خشک لب چشم تر کباب جگر — آئے سب پیش ساقی کوثر

عرض کی اے سحاب جود و سخا — ابر باراں کی حق سے کیجئے دعا

وہ محیط علوم و بحر سخا — متوجہ سوئے حسین ہوا

از رہِ مہربہ کیا ارشاد — اے دُرِ کان لطف و پاک نہاد

طالب آب ہو خدا سے تم — جوش زن تا ہو رحم کا قلزم

جھوم کر سامنے گھٹا آئے — خشک سالی میں آب برسائے

سرو جو بار احمدی اُٹھا — دُر دریائے سرمدی اُٹھا

ہاتھ اٹھا کر و فور رغبت سے — کی ادا حمد حق فصاحت سے

آبروبخش دُرِ بحر سخا — سائل آب کبریا سے ہوا

تو تھا ساقی شراب طہور — ابر کا جو ہوا فلک پہ ظہور

بنت رز کی طرح گھٹا پہونچی — جھومتی لڑکھڑاتی آ پہونچی

برق پیش نظر چمکنے لگی — کمر ناز میں لچکنے لگی

رعد چشم غضب اڑانے لگا — ابر رہ رہ کے گڑگڑانے لگا

کوہ کن محو دید مجنوں رنگ — جو تھے شیریں ادا و لیلی رنگ

اس قدر آب متصل برسا — کہ ہوئے ایک دشت اور دریا

آسماں سبز گوں زمیں شاداب — ہر طرف موج مارتا تھا آب

رحمتِ حق نبی کا تھا جانی　　نہ گرم تے دم ملا پانی

مراثی | میرا اندازہ ہے کہ مرثیے تقریباً ایک ہزار سے زائد کہے ہونگے۔ اس موقع پر بھی انتخاب کے طور پر چند بند لکھے جاتے ہیں:۔

تفاخرِ شاعرانہ

کافی ہے زمینِ سخن نظلم کی جاگیر　　چہرہ ہے مضامیں کے رسالوں کا بھی تحریر
تیغ میں زباں ہے یہی خنجر یہی شمشیر　　ڈنکا ہے مرا نعرۂ یا حضرت شبیر
نے طالبِ دینار نہ خواہانِ درم ہوں
عالم میں اسی ملک کا باسیف و قلم ہوں

ہر رنگ کے طائر ہیں یہاں صرفِ ترانہ　　لیتے ہیں مزے گلشنِ رنگیں میں شبانہ
تازہ گلِ رنگیں کا سناتے ہیں فسانہ　　عاجز نہیں بندش میں مری طبع یگانہ
گلدستۂ مضموں کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
جس رنگ کو چاہوں اُسے سو رنگ سے باندھوں

زلفوں میں جو شعروں کی جھلک حسنِ عمل کی　　سنبل کو سنا دے کہ نہ لے بائیں بل کی
درکوں سے ہے تاب نہیں رد و بدل کی　　مہتاب کی چادر سرِ گردوں سے ہے ڈھلکی
فردِ نظری پیشِ نظر چاند ہوا ہے
مدت سے یہاں شہرہ رچاند ہوا ہے

چھوٹیں نہ صف آرائی کے ہنگام رقم بند　　ہو جائیں زباں آوروں کے دیکھ کے دم بند
تدبیر کی راہیں ہیں نہ ابواب ستم بند　　کر توڑ مضامین و معانی کو قلم بند
جس کو نہیں کچھ حفظ سخن نو سے ہمارے
کہہ دو کہ نکل جائے قلمرو سے ہمارے

ظاہر ہیں ہے کیا سود چھپانے سے ہمارے　　خالی نہیں ہونے کا لٹانے سے ہمارے۔
جاری ہے سدا فیض گھرانے سے ہمارے　　لے جس کو ضرورت ہو خزانے سے ہمارے

میں محفل میں مشہور کسی طور نہیں ہوں
میدان سخن کا ہوں کوئی اور نہیں ہوں

شعروں کی مری شان نہ دیدہ نہ شنیدہ   الفاظ بھی نایاب معانی بھی ہیں چیدہ
قافیوں میں انھیں خون جگر پی کے خریدہ   تا رنج کشیدہ نہ کوئی ظلم رسیدہ
نظم و نسق ایسے کسی کشور میں نہیں ہیں
بھرتی کے سپاہی مرے لشکر میں نہیں ہیں

میداں سے قدم گڑ کے اکھڑتے نہیں میرے   منہ پر ستم آرا کبھی چڑھتے نہیں میرے
تیور کسی حالت میں بگڑتے نہیں میرے   مضمون لڑائی کے بھی لڑتے نہیں میرے
گو شغل رسالوں کے الٹنے کا رہا ہے
مصرعہ مرا یہ عذر توارد سے بچا ہے

عجز و انکسار

بیجا ہے خطائے بشریت کی مناہی   کھا جاتے ہیں دھوکے کبھی زخم سپاہی
بے زور طبیعت کی ولایت ہے کماہی   آجاتی ہے ساحل پہ تڑپ کر کبھی ماہی
اک حال پہ گردوں کو نہ پھرتے ہوئے دیکھا
گھوڑوں سے سواروں ہی کو گرتے ہوئے دیکھا

گھوڑے کی تعریف

اڑتا ہوا اس طرح ستارا نہیں دیکھا   یوں نعل در آتش کبھی پارہ نہیں دیکھا
یہ دوڑ یہ تیزی یہ طرارا نہیں دیکھا   ایسا کبھی چالاک چکارا نہیں دیکھا
ٹھہرے نہ قدم اوج میں اور پیچ میں اسکے
ہلکی تھی ہوا کون پڑے بیچ میں اسکے

تلوار کی تعریف

بھڑکا تھا عجب تیغ شرربار کا شعلہ — سرد اس کے تھا آگے کرۂ نار کا شعلہ
کیا آتش نمرود جفاکار کا شعلہ — دوزخ کو جلانے لگا تلوار کا شعلہ
سب ہوگئے تھے بھُن کے سیہ فوج عدو میں
سودا تھا یہ غالب کہ نہ سرخی تھی لہو میں

ایک مرثیہ جو حضرت قاسم کی شان میں ہے | اختصار کے خیال سے چند بند لکھتا ہوں۔ مطلع کا مصرعہ یہ ہے:—
؎ جس دم عروس صبح نے الٹی نقاب شب

صبح کا منظر اور حضرت قاسم علیہ السلام کی حالت

پھولا ہوا وہ صبح کا گلشن قریب دور — وہ معرفت میں حق کی نواسنجیٔ طیور
نوبادہ حسن کو مگر تھا نہ کچھ سرور — پژمردگی سے دل کے تردد کا تھا وفور
ساماں تھے پیش چشم جو امید و بیم کے
گہ سرد گاہ گرم تھے جھونکے نسیم کے

تھا رنج اور سرور جو باہم کم و زیاد — نظروں میں تھا کبھی خط ابیض کبھی سواد
بھولی نہ تھی دورنگیٔ گردونکی دل سے یاد — توام تھا بس بہار و خزاں سے گل مراد
ہر ایک دم خیال کمال و زوال تھا
تیرہ کا چاند بدر تھا گاہے ہلال تھا

روشن تھا عکس تار شعاعی سے سب کچھار — اوراق گل پہ جدول زریں کی تھی بہار
پڑتی تھی ضو جو مثل نظر آکے بار بار — رہ رہ کے رنگ ڈھنگ بدلتا تھا سبزہ زار
سبزہ کے آب و تاب کے شہرے تھے عرش پر
تھا لطف دھوپ چھاؤں کا مخمل کے فرش پر

وہ حسن کا فروغ وہ آمد شباب کی — رنگت سفید و سرخ لطافت گلاب کی

اللہ رے آب و تاب رخ لاجواب کی — سہرے کی ہر لڑی تھی کرن آفتاب کی
خورشید کی شعاع و فور سرور سے
رومال زرنگار ہلاتی تھی دور سے

ایک بینیہ مرثیہ سے چند بند

منتخب کرکے لکھے جاتے ہیں، طول کے خیال سے اور نقل کرنے کی جرأت نہیں کرسکا ورنہ کل مرثیہ بے نظیر ہے :—

کیفیت جنگ کی لکھوا چکا جب بانیٔ شر — پیک ہر سمت روانہ ہوئے رخصت ہوکر
پہونچا یثرب میں جو غمگین و حزیں نامہ بر — منتشر شہر مدینہ میں ہوئی غم کی خبر
جان صغرا کی تردد کے سبب جانے لگی
وحشت انگیز خبر سنتے ہی گھبرانے لگی

تھے جو اس شہر کے لٹنے کے نمایاں آثار — ہوگئیں بند سر شام دکانیں یکبار
دل مکدر ہوا گلیوں میں لگا اڑنے غبار — متحیر تھے مکانوں میں صغار اور کبار
رو کے کہتے تھے کہ رب دوسرا خیر کرے
در و دیوار لرزتے ہیں خدا خیر کرے

تذکرے تھے یہی مردوں میں کہیں جا باہم — دیکھئے سنتے ہیں ہم کیا خبر شاہ امم
عورتوں کا تھا کہیں غول پریشاں پرغم — چپکے چپکے یہ بیاں کرتی تھیں با دیدۂ نم
جس طرف دیکھو اداسی سی ادھر چھائی ہے
دل کو ایک ہول ہے کیسی یہ خبر آئی ہے

خود بخود آنکھوں سے اب اشک بہا جاتا ہے — نہ غذا بھاتی ہے نا آب خنک بھاتا ہے
بے قراری سے جگر منہ کو چلا آتا ہے — کان رکھ کر جو سنو کوئی یہ چلاتا ہے
کیوں نظر آئے نہ یہ شہر سراسر خالی
ہوگیا فاطمہ زہرا کا بھرا گھر خالی

جا بجا مستعد ظلم و جفا ہیں اعدا — جان زہرا کا نگہبان ہے غربت میں خدا
نہ پیمبر ہیں نہ حیدر نہ حسن نے زہرا — کون ہے پنجتن پاک میں اب شہ کے سوا

خیریت پھر ہمیں اللہ دکھلائے اُن کو
نظر بد سے لعینوں کے بچائے اُن کو

مرثیہ ان کا پسران مسلم کے حال میں بہت مشہور و مقبول ہے۔ اکثر سادات کی بستیوں میں پڑھا جاتا ہے لکھنؤ میں بھی مشہور تھا مطلع یہ ہے:۔

زینب پہ ہے تمام محبت حسین کی

ناواقف اسکو شبیر مرحوم کا مرثیہ سمجھتے ہیں۔ اور بھی بہت سے ان کے مرثیے ہندوستان کی بستیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

غزلیں جب مقصود علی صاحب کا انتقال ہو گیا تو اُن کے بیٹے معظم علی صاحب نے سفیر مرحوم کی بہت خاطر و مدارات کی اُنکو غزلوں کا بڑا شوق تھا خود طرحیں دیتے اور غزلیں کہواتے تھے۔ غزلوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہے کہ طبیعت نہایت شوخ پائی تھی زیادہ تر داغ و امیر کی طرح شوخ کلام ہوتا تھا۔ اکثر مقاموں پر منشی منیر کا رنگ ہو جاتا تھا۔ لیکن کلام کی شوخی کم نہیں ہونے پاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گانے والی غزلیں کہتے بھی تھے۔ چونکہ طبیعت ان کے لئے نہایت موزوں پائی تھی اور ذہی استعداد شاعر بھی تھے اس لئے بلا جدید مضامین نظم کئے نہ رہ سکتے تھے۔ کہ اچھی زمین میں عمدہ طور سے روئیدگی ہوا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ پائمال قافیوں کو اس ترکیب سے باندھ دیتے تھے کہ مشاق بیٹھے رہ جاتے تھے۔

قصیدہ قصیدے بھی بہت سے کہے ہیں وہ سب صنائع و بدائع سے پُر ہیں۔ اکثر میں تو یہ التزام کیا ہے کہ جس کے شان میں قصیدہ کہا ہے اُس کا نام ہر مصرعہ کے پہلے لفظ سے نکلتا ہے زیادہ تر فارسی اور عربی کی بیں اشعار میں رکھتے تھے۔ جس سے اُن کے معیار علمی کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

رباعی رباعیاں ہزاروں کہہ ڈالی ہونگی۔ لیکن سب تلف ہو گئیں۔ فی الحال تلاش کرنے پر دو رباعیاں ملی ہیں جو درج کی جاتی ہیں۔

کیا مجمع مومنین کے گلدستے ہیں — ہنگے ہیں یہی اور تو گل سستے ہیں
اے باد صبا پوچھ تو آ رضواں سے — ایسے بھی ترے باغ میں گل بستے ہیں

بلبل کو گلوں سے نفع جز یاس نہیں — یوں زر کو چھپائے ہیں کہ کچھ پاس نہیں
جاتا رہا ایسا چمن دہر سے فیض — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو باس نہیں

حالات

جب نواب محمد ملیح صاحب کا بھی انتقال ہوگیا تو یہ اپنے گھر واپس آئے۔ سن کافی پہونچ چکا تھا۔ دو سال رہ کر موضع سونی میں انتقال فرمایا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون عمر تقریباً اسی سال سے تجاوز کرگئی تھی۔ تاریخ وفات نقعدہ ۱۳۲۳ھ ہجری یوم دوشنبہ مطابق ۱۹۰۵ء ہے۔

کلام کی حالت

ان کے کلام کا کچھ حصہ گجگاؤں میں تھا جہاں انہوں نے اپنی عمر عزیز کے بیش قیمت اوقات کو صرف کئے تھے۔ مگر صفیر مرحوم کے چھوٹے لڑکے سید علی ضمیر صاحب جاکر۔ سید مبارک حسین صاحب رئیس گجگاؤں نواب محمد ملیح صاحب سے مانگ لائے اور جناب موصوف نے نہایت اخلاق اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے حوالہ ۔ بقیہ کلام نواب محمد ملیح صاحب کے نواسے سید طالب حسین صاحب درخویش سید سجاد حسین صاحب ساکنان شہر جونپور ن دریبہ۔ مکان گول دروازہ کے پاس اب تک موجود ہے۔ جس میں علاوہ مرثیہ وغیرہ کے غزلیں اور نوحے بھی کثرت ں۔ جو مرثئے کہ صفیر مرحوم کے بڑے لڑکے سید علی بشیر صاحب کے پاس موجود ہیں' انکی تعداد تقریباً پانچ سو ہوگی۔ لیکن بوہ سے اب تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان کی تصانیف میں سے مثنوی زبدۃ المعجزات تو چھپی ہے' باقی کلام چھپا ہوا اور غیر مطبوعہ ہے۔ یہ مثنوی ۱۸۱۱ء میں تمام ہوکر شایع ہوئی ہے کہتے ہیں:-

روئے ہجری سے طبع کی تاریخ   ی رقم تعمیہ ریاض النور ۱۳۰۴

کلام پر رائے

ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مشاق و باخبر تھے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور انکی تصانیف سے ہر قسم کا کچھ نہ کچھ کلام فراہم ہوسکتا ہے۔ مرثیہ میں قدم بہ قدم مرزا دبیر کی تاسی کی ہے انکے کلام کے دالوں کو یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ عمر انکی مفلسی میں صرف ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعروں سے اسکی جھلک صاف نمودار ہے۔ قع پر چونکہ نیچر کلام ہوتا ہے اس لئے اثر میں ڈوبا ہوا ہے اور اکثر اشعار میں اس قدر سوز و گداز ہے کہ دل پر تیر و نشتر رتے ہیں۔ غزلیں مضامین جدیدہ سے گلہائے تازہ کا بو باس رکھتی ہیں۔ اور ان کے رنگینیٔ الفاظ پر گلہائے خوش رنگ کا ہوتا ہے۔ زبان سیدھی سادی پیاری اور دلکش ہے۔ قصیدوں میں ادق الفاظ اور پرشکوہ مضامین نظم کئے ہیں۔ باغت و متانت ہزار جان سے قربان ہے۔ مرثیوں اور سلاموں کا انداز قریب قریب مرزا دبیر سے ملتا جلتا ہے بعض مقاموں پر زور کلام سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ مرزا دبیر کا مرثیہ ہے' لیکن اکثر مقاموں سے انیسی رنگ کا پرتو بھی رتا ہے (جو غالباً ہم عصری کی وجہ سے ہوگا) غرضکہ بلاغت و فصاحت ہر دوش بدوش ہیں نمونہ کے مرثیہ سے ناظرین ندازہ کرلیں گے۔

واقعات کی صحت کے لئے صفیر مرحوم کے پسر ابو صاحب سید علی نصیر صاحب ہر طرح ذمہ دار ہیں۔ جو تحصیل علم کے لئے عرصہ تک اپنے والد ماجد کے ہمراہ گجگاؤں [illegible] ان کی زبانی چند واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔

از جناب ماہ منیر خاں صاحب بی۔ اے (آنرز) بی۔ ایل جرنلسٹ ، گیا

یہ فسانہ میرے قلم سے انگریزی اور بنگلہ میں چھپ چکا تھا، اب ناظرین ندیم کی دلچسپی کے لئے اردو میں پیش ہے۔ اختر

سندر، سیلندر اور میں ۔ ہم تینوں ایک ساتھ رہتے تھے ۔ لا کالج کے قریب ہم نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ اور تینوں اوسی میں تھے مسلسل چار سال ہوسٹل میں زندگی گذارنے کے بعد ہمارے اندر اب ہوسٹل کے قوانین کے ماتحت رہنے کی سکت نہ تھی۔ ہم تینوں نے لا کالج میں داخلہ لیا تھا۔ سندر اور سیلندر دوراندیشی کے خیال سے ایم۔ اے کے لکچروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ مگر میں نے صرف لا ہی پر قناعت کی تھی۔ لا کالج کی مجہول زندگی نے ہماری رہی سہی امنگوں پر بھی پانی پھیر دیا تھا، صبح شام کالج جانا اور وہاں بیدلی سے لکچر سننا ہماری زندگی کے ایسے جزو بن گئے تھے۔ جن سے موت کے سوا کسی صورت چھٹکارا ملنا ممکن نہ تھا۔ تمام دن کے تھکے ماندے وکالت پیشہ پروفیسروں کے لکچر ایسے خواب آور ہوتے تھے کہ ہم اونہیں میٹھی لوریاں سمجھ کر کلاس ہی میں سو جاتے تھے ۔ ۱۲۵ لڑکوں میں کم و بیش ۱۱۵ ایسے گہرے مراقبہ میں چلے جاتے تھے کہ اونہیں غریب پروفیسر تو کیا معنی دنیا کی بڑی سی بڑی طاقت بھی جگا نہ سکتی تھی۔ ہم سب پڑھے لکھے تعلیم یافتہ بیکاری تھے اور ہماری مسلسل بے روزگاری سے تنگ آکر ہمارے لائق والدین نے دنیا کو ہماری شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے ہمیں وہاں رکھ چھوڑا تھا۔ سوسائٹی کے رخ زیبا پر ہماری مثال سیاہ دھبوں کی سی تھی، ہماری بی۔ اے اور ایم۔ اے تک کی تعلیم اور ہمارے تعلیم یافتہ معیار زندگی نے ہمارے والدین کو باستثنائے چند مفلس و قلاش کر کے چھوڑا تھا، پھر بھی [illegible] لوم کیسے وہ بیچارے زمینیں گرو رکھ کر یا گھر زیورات بیچ کر ایک [illegible]) پر ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ہمارا وظیفہ بھیجا کرتے [illegible] ہم [illegible] دماغی اور جسمانی بیکاری میں اون روپیوں سے مزے اڑاتے تھے۔ پڑھنے لکھنے سے ہمیں کبھی کوئی واسطہ نہ رہتا تھا بلکہ بی۔ اے یا ایم۔ اے

تک ہم نے جو کچھ پڑھا تھا اوسے قریب قریب بھلا چکے تھے
مگر پھر بھی ہم میں سے ہر فرد اپنے آپ کو ملٹن یا شیکسپیر سے
کم نہ سمجھتا تھا، ہفتوں کے بعد اگر کبھی کوئی اخبار ہماری نظر
سے گذرتا تو اوس میں بھی محض خالی شدہ ملازمتوں کے کالم
کو ہم پڑھ لیتے تھے۔

سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ ہم لوگوں میں سے زیادہ
طلبہ ایسے تھے جن کے ساتھ کسی معصوم اور بیزبان ہندوستانی
لڑکی کی قسمت بھی وابستہ کر دی گئی تھی۔ اول تو مجھے شادی سے
بذات خود ہی نفرت تھی، دوسرے ایسی شادی کو جس میں شادی
کا خاص رکن یعنی مرد بے روزگار یا طالب علم ہو میں زہر ہلاہل
سمجھتا تھا۔ سندر شادی شدہ تھا اس لئے جب کبھی ہم
تینوں میں شادی پر بحث ہوتی تو وہ غریب خاموش رہتا
اور کبھی کبھی اپنی بے وقت کی شادی پر افسوس بھی کرتا تھا
مگر سیلندر جو فطری طور پر ذرا تند و تیز واقع ہوا تھا شادی کا
بڑا حامی تھا مگر خود کنوارا تھا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ اگر لوگ
شادی نہ کریں گے تو یہ غریب بے بس لڑکیوں کی کثیر تعداد
کیا کریگی۔ مگر اپنے دلائل سے وہ کبھی میری تشفی نہ کر سکا۔ سیلندر
تو کیا خود میرے پتا جی سے اور مجھ سے اس معاملے پر اکثر نوک
جھونک ہو چکی تھی۔ بہت دنوں تک اسی وجہ سے اونھوں نے
مجھ سے بولنا تک ترک کر دیا تھا، ماتا جی میری ہٹ دھرمی پر
گھڑوں آنسو بہا چکی تھیں۔

دسمبر کی ایک صبح کو ہم لوگ چائے پی کر کمبل اوڑھے
بیٹھے ہوئے تھے۔ بلا کی سردی تھی۔ دانت سے دانت
بج رہے تھے۔ پچھم کی سرد ہوا جسم کی ہڈیوں کے مغز کے اندر
پیوست ہو رہی تھی۔ سندر اور میں ہم دونوں سر سے پاؤں
تک کمبل میں لپٹے ہوئے تھے۔ سیلندر یکایک اپنی جگہ سے
اوٹھا اور کہنے لگا کہ اگر ہم دونوں میں سے کوئی اس وقت
گنگا جا کر اشنان کرلے اور پھر ویسے ہی بھیگے کپڑوں میں
گھر واپس آجائے تو اوسے بہادری کی ایک سند دی جائیگی
اور ساتھ ہی ساتھ دس روپے انعام۔ ویسی سردی میں
اشنان کا تصور بھی تکلیف دہ تھا۔ سندر نے میری طرف
دیکھا اور میں نے اپنے کمبل کو قریب کھینچتے ہوئے اپنی نگاہیں
نیچی کرلیں۔ دو چار سکنڈ گذرے اور جب سیلندر نے ہم
دونوں میں سے کسی کا کوئی جواب نہ پایا تو اوس نے میری
جانب بڑی حقارت سے دیکھا کیونکہ اون دونوں سے
میرے ہی ہاتھ پاؤں اچھے تھے، میرا ۵ فٹ ۱۰ انچ کا قد اور
ایک من ۳۵ سیر کا وزن واقعی قابل رشک تھا۔ سیلندر
تمام ہندوستان کے مردوں کو بزدل کہہ کر گالیاں
دینے لگا اور رامائن اور مہابھارت کے ایام کی بہادری
کے واقعات دہرانے لگا۔ تھوڑی دیر تک تو میں سیلندر
کی باتوں کو سنتا رہا، یکایک مجھکو بھی طیش آیا اور کمبل پھینک
کر میں نے سیلندر کا چیلنج قبول کرلیا۔ گنگا جا کر اسی وقت
اشنان کرونگا اور بھیگے کپڑوں میں واپس آؤنگا۔ سندر
میری ہمت پر دنگ رہ گیا۔

میں نے سلیپر اتاری، سویٹر، قمیض، گنجی سب
کو جسم سے علیحدہ کیا اور ننگے سر ننگے پاؤں ایک دھوتی

پہنے گنگا گھاٹ کی طرف چل کھڑا ہوا۔ راستے میں سردی سے میرے تمام اعضا شل ہو رہے تھے۔ سڑک اتنی سرد تھی کہ گویا تلوؤں میں چبھ رہی تھی۔ پانی میں غوطہ لگانے کے خیال سے ہوش و حواس اور پراگندہ ہو رہے تھے۔ بہرحال افتاں و خیزاں میں گھاٹ پر پہونچا۔ عورتوں اور بچوں کو نہاتے دیکھ کر میری ہمت بڑھی اور میں بھی کڑا کر کے پانی میں اتر گیا۔ اور دو چار غوطے لگائے۔ غوطہ لگانے کے بعد میں نے ایک عجیب تازگی محسوس کی۔ مگر اب بھیگے کپڑوں میں گھر جانے کا سوال تھا۔ میں نے اپنی دھوتی کا پانی نچوڑ کر انگوچھے سے اپنے منھ کو چھپایا اور سردی سے کپکپاتے ہوئے گھر کی طرف چلا۔ میں بمشکل گھاٹ سے سو گز کے فاصلے پر گیا تھا کہ یکایک پیچھے سے کسی نے آواز دی "اے۔ ٹھہرو۔ سنتے جاؤ۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ ایک متوسط عمر کے تن و توش والے بابو جی مجھے چھڑی ہلا کر ٹھہر جانے کو فرما رہے ہیں۔ میں بھیگے کپڑوں میں سردی سے ٹھٹھرا جا رہا تھا۔ مجھے بابو جی پر بہت غصہ آیا۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ خدا رحم کرے بابو جی مجھے کیوں روک رہے ہیں، شاید کسی اور کا وہ مجھ پر دھوکا کھا رہے ہیں۔ بابو جی اب بالکل میرے قریب پہونچ گئے۔ ان کے سر پر گلوبند لپٹا ہوا تھا اور جسم پر ایک بھاری اوورکوٹ۔ بابو جی نے میرے قریب پہونچ کر کہنا شروع کیا "ابے تم ہی نہ شام بابو کے یہاں تھے۔ ان کے یہاں سے تم نے کب چھوڑ دیا۔ معلوم ہوتا ہے ان دنوں تم بیکار ہو ——— بابا جی میرے ہی یہاں نوکری کیوں نہیں کر لیتے ہو۔ کل سے میرا رسوئیا بھاگا ہوا ہے۔ دیکھو میں کھانے پینے کے ساتھ ساتھ سات روپے تنخواہ دیتا ہوں، اور دوسرے میرے یہاں آدمی بھی زیادہ نہیں ہیں، صرف تین آدمی، تمہیں زیادہ کام بھی نہ کرنا پڑیگا۔" میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل چلی تھی، میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، میں نے دل ہی دل میں اوس مردود سلیندر کو خوب کوسا۔ ظالم نے مجھے کس آفت میں پھنسا دیا تھا۔

میں نے اپنے جنیئو کے دھاگے سے پانی کو نچوڑ کر بابو جی سے معذرت کر کے جانا چاہا مگر نہ معلوم اون کی آنکھوں میں کون سا جادو تھا کہ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب میرے لئے یہ انتہائی مشکل تھا کہ بابو جی کو اپنا اصلی نام بتاؤں اور ان کے دھوکے کو رفع کردوں۔ بابو جی نے میرا ہاتھ پکڑا اور آہستگی سے کھینچتے ہوئے اپنے گھر کی طرف لے چلے، میرا یہ حال تھا ــــہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ نیم مذاق اور نیم سنجیدگی سے میں بھی ان کے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے دو ایک دفعہ بھاگنے کی کوشش کرنی چاہی مگر کسی نامعلوم شئی نے مجھے باز رکھا۔ معشوقوں کے بال کی طرح پیچ و خم کھاتی ہوئی گلیوں سے گذر کر ہم ایک دو منزلہ مکان کے پاس پہونچے، میں دروازہ پر ٹھہر گیا مگر بابو جی نے مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ بابو جی کے بچے وغیرہ اوپر کی منزل میں رہتے تھے نیچے صرف ایک ننھا سا صحن، ایک کنواں اور دو کمرے تھے جن میں سے ایک رسوئی گھر کے مصرف میں آتا تھا،

اور دوسرا "ٹھنڈا" رکھے۔ رام بابو نے مجھے رسوئی گھر میں لے جا کر اپنی جیب سے گھڑی نکالتے ہوئے کہا "دیکھو ابھی آٹھ بجے ہیں میں ۹ بجے دفتر جاتا ہوں ۴۵ منٹ میں رسوئی طیار رہے۔ رام بابو (میرے مالک کا یہی نام تھا مجھے بعد میں معلوم ہوا) نے مجھے ایک ماہر رسوئیا سمجھا تھا کاش اونہیں یہ معلوم ہوتا کہ لا کالج اور رسوئی گھر سے کس قدر فاصلہ تھا تو وہ مجھ پر اسی قدر ترس کھاتے جس قدر میں اپنے اوپر ترس کھا رہا تھا۔ چولھا ٹھنڈا پڑا تھا رسوئی گھر میں جھاڑو نہ دی گئی تھی۔ راکھ کا ڈھیر ادھر ادھر بکھرا پڑا نظر آتا تھا۔ میں نے آج تک کبھی آگ نہ جلائی تھی بلکہ پکنک کے موقعوں پر جب کبھی اسکی کوشش کی تو ناکام ہی رہا تھا

میں نے چند لکڑیوں کو چولھے میں ڈال کر آگ سلگانے کی کوشش کی تو چند ہی منٹ کے بعد دیا سلائی کی پوری ڈبیا صاف ہو گئی اور چولھا سرد کا سرد ہی رہا۔ بڑی دیر کے بعد بھی جب رام بابو نے رسوئی گھر سے دھواں اٹھتے نہ دیکھا تو وہ نیچے آئے مگر اس دفعہ اون کے ساتھ ایک چھریرے جسم کی مالک بڑی بڑی آنکھوں والی ایک حسین دوشیزہ بھی تھی۔ رام بابو نے دیا سلائی کی ڈبیا کو خالی اور چولھے کو ٹھنڈا دیکھ کر مجھ پر ترس کھاتے ہوئے کہا "رمبھا۔ بیٹی ذرا اس بیچارے کو اس کا کام بتا دو" یہ کہہ کر رام بابو اوپر چلے گئے رسوئی گھر میں اب صرف رمبھا تھی اور میں۔ جو کام مجھ سے تمام عمر میں نہ ہو سکتا وہ صرف چند لمحوں میں رمبھا کے نازک ہاتھوں سے انجام پا گیا۔ آگ جلائی گئی اور رسوئی پکنی شروع ہوگئی۔ میں اپنی بی۔ اے تک کی تعلیم کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ رہا تھا۔ لعنت ہے اوس تعلیم پر جس سے انسان آگ جلانا بھی نہ سیکھ سکے۔ کاش ہمارے تعلیمی نصاب میں عملی زندگی گذارنے کی کچھ تعلیمات بھی ہوتیں۔

رمبھا نے مجھے شیریں آواز میں مخاطب کرکے "بھوجیا کے لئے آلو تراشنے کے لئے کہا۔ افسوس کہ اس کا بھی عمر میں پہلا سابقہ تھا۔ میں نے آلو کاٹنے شروع کئے تو اقلیدس کی تمام ممکن اور غیر ممکن شکلیں کٹے ہوئے آلوؤں کی صورت میں نمودار ہونے لگیں۔ ابھی میں نے دو چار ہی آلو کاٹے تھے کہ میں نے اپنی انگلی کاٹ ڈالی۔ میری کٹی ہوئی انگلی سے خون نکلتے دیکھ کر رمبھا کو بڑا رحم آیا۔ اس نے کنوئیں پر لیجا کر میری انگلی دھوئی اور اوپر سے کپڑے کی ایک دھجی لا کر اوسکو انگلی پر لپیٹ دیا۔ آہ ایک غریب رسوئیا اوس کے احسانات کا کیا بدلہ دے سکتا تھا۔ اسوقت وہ سراپا میرے سامنے کھڑی تھی۔ میری دزدیدہ نگاہیں اسکے چہرے پر تھیں۔ بلا کی صباحت تھی آنکھوں میں حسن کی ایک بلوریں دنیا آباد تھی اسکی نرم و نازک جلد کے اندر سے جوانی کا خون ایسا جھلک رہا تھا جیسے انگور کے دانوں میں ان کا رس۔ تھوڑی دیر کے بعد رسوئی تیار ہوگئی مگر سب کچھ رمبھا ہی نے کیا تھا۔ مجھ سے کیا ہوتا۔ رام بابو نے بھوجن کیا اپنا حقہ پیا اور دفتر چلے گئے۔ اوس کے بعد رام بابو کا دس سالہ بچہ بچن رسوئی کھا کر اسکول گیا اب گھر میں صرف میں تھا اور رمبھا۔ رمبھا بھی اپنے کمرے میں جا کر کچھ پڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بھی اوپر گیا تو

رمبھا کے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا مجھے دیکھ کر اوس نے اپنی کتاب رکھدی' اور رام بابو کی ایک پرانی قمیض نکالکر اودھیں جہاں جہاں مرمت کی ضرورت تھی سی کر مجھے پہننے کو دی۔ غالبًا رام بابو اوس سے کہہ گئے تھے کہ ایک پرانی قمیض مجھے پہننے کو دیدے۔ اسکے بعد رمبھا نے بڑی سادگی سے مجھے اپنے گھر کا سارا حال کہہ سنایا۔ گذشتہ سال اوسکی ماں مری تھی رام بابو کی تنخواہ ۱۱۰۲ روپیہ وغیرہ۔

اب یہ روزانہ کا معمول ہوگیا تھا جب رام بابو اور بچن چلے جاتے تو میں رمبھا سے بیٹھا باتیں کرتا کبھی میں اوس کی کتابوں کے مشکل جملوں کو اوسے سمجھا دیتا تو وہ بڑا تعجب کرتی مگر میں نے اوس سے کہدیا تھا کہ تھوڑی سنسکرت میں نے پاٹ شالے میں پڑی تھی۔ چونکہ وہ فطرتًا بڑی سیدھی سادھی تھی اوسے میری باتوں کا یقین ہوجاتا۔

ایک دن دوپہر کو میں نیچے رسوئی گھر کے دالان کے پاس بیٹھا ہوا اپنی قسمت کی نیرنگیوں پر کچھ سوچ رہا تھا کہ رمبھا نے مجھے اوپر سے پکارا "باباجی یہاں آیئے" میں نے اوپر جاکر دیکھا کہ رمبھا اپنے بستر پر پڑی ہے۔ میں نے اوس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو غریب کو بڑا تیز بخار تھا۔ مجھے اوس کے حال پر بڑا رحم آیا۔ غریب بے ماں کی بچی تھی۔ میں شام تک اوس کے پاس بیٹھ کر اوس کی سیوا کرتا رہا۔ رام بابو دفتر سے آئے تو ڈاکٹر سے اوس کا حال کہہ کر دوا لے آئے۔

رمبھا کی بیماری کے دوسرے دن ایک خط میرے نام رام بابو کے توسط سے پہونچا۔ ڈاکیہ نے مجھے بڑے شبہ کی نظر سے دیکھتے ہوئے وہ خط میرے حوالے کیا۔ کوئی دوسرا آدمی میرے اور ڈاکیہ کے سوا وہاں موجود نہ تھا ورنہ افشائے راز ہوجاتا۔ خط سیلندر کا تھا۔ مردود خود مجھے اس آفت میں پھنسا کر خود ہی مجھ پر لعنت اور ملامت کے تیر برسائے تھے اور لکھا تھا کہ میں نے رسوئیا کا ادنیٰ کام کرکے اپنے خاندان کی عزت آبرو خاک میں ملادیا تھا۔ خط میں مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر چھ بجے شام تک اوس دن میں گھر نہ پہونچا تو سیلندر لڑکوں کے ایک گروہ کے ساتھ پہونچے گا اور مجھے رام بابو کے گھر سے زبردستی لے جائے گا۔ بڑا اچھا مذاق ہوتا اگر سب لڑکے آتے اور مجھے لے جاتے۔ رام بابو کی شکل اوس وقت قابل دید ہوتی۔ مگر مجھے غریب رمبھا کا خیال تھا کیونکہ ان چند دنوں میں میں اوسکی پوجا کرنے لگا تھا اوس کے نازک دل کو ان باتوں سے بڑا دکھ پہونچتا۔

سہ پہر کو چپکے سے صبر و قرار کا دامن ہاتھ میں تھام کر رام بابو کے گھر سے نکلا اور لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا اپنے گھر پہنچا۔ سندر' سیلندر موجود تھے۔ اونھی پر وہ دونوں برس پڑے۔ اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں نے رام بابو کی ملازمت قبول ہی کیوں کی تھی؟ اور بھاگ کیوں نہ آیا؟ مگر اُن دونوں کو کیا معلوم تھا

ے میری تقدیر کا فیصلہ رام بابو کے گھر ہے گیا تھا کیونکہ رمبھا کو
دیکھتے ہی اوس کی پیاری نگاہیں میرے دل میں اتر گئیں
ی دیر تک ہم تینوں اس واقعہ پر خوب ہنستے رہے سیلندر
نے میری طرف ایک نوٹ کے بجائے دس دس کے دو نوٹ
بھنائے اور یہ دونوں نوٹ کسی اعلیٰ پیمانہ کے [illegible]
لئے محفوظ رکھ دئے گئے اور اوس دن سے میں سارے
کالج کے لڑکوں کا "ہیرو" بن گیا۔ مگر رمبھا کی یاد مجھے
ہر دم ہر ساعت تڑپایا جاتی تھی، اوس کے دیکھے بغیر میں
بیتابی کی ایک کمی محسوس کرتا تھا۔

رام بابو کے گھر سے آنے کے دو چار دن کے بعد
پتاجی کا ایک خط میرے پاس پہونچا۔ وہ مجھے دیکھنے آرہے
تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ میں تندرست تو تھا، پتا کا
تھا پھر مجھے دیکھنے کی ضرورت اونہیں کیوں محسوس ہوئی۔
سندر سیلندر نے مجھے یہ کہکر اور ڈرا دیا کہ ضرور اس واقعے
کی خبر کسی نے پتاجی کو کردی ہے ورنہ بغیر کسی ضروری کام کے
وہیں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

پتاجی آئے تو میں بہت ڈرا ہوا اون کے پاس
گیا۔ سندر اور سیلندر سے میں نے کہہ دیا تھا کہ بھائی اگر
پتاجی اوس واقعہ کے متعلق دریافت کریں تو تم لوگ کہنا
کہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ ایسا واقعہ منگل کے ساتھ کبھی
پیش نہیں آیا۔ پتاجی دیکھنے میں بہت خوش نظر آئے۔
کچھ دیر تک محض ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اوس کے بعد
سندر اور سیلندر میرے دونوں دوستوں کو مخاطب
کرکے اونھوں نے کہا "تم لوگ ایک خبر سنکر بہت خوش ہوگے۔ منگل
کی نسبت میں نے ایک جگہ ٹھیک کرلی ہے۔ لڑکی بڑی اچھی
مل گئی ہے، جوڑا بڑا اچھا ہے، اور تمہیں دعوت کھانے بہت
دور نہ جانا ہوگا۔ کیونکہ منگل کے ہونے والے سسر اسی
شہر کے باشندہ ہیں۔" یہ سنتے ہی گویا مجھ پر بجلی گرگئی۔ میں نے
اپنی شادی کے مسئلے پر فلسفیانہ طور پر بڑی حد تک غور و خوض کرچکا
اس کے لئے مہیا نہ تھا۔ مگر دو ایک دفعہ اسی مسئلہ پر پتاجی
مجھ سے بہت خفا ہو چکے تھے اس لئے اس دفعہ انکار کی بھی
گنجائش نہ تھی۔ پھر وہ دونوں شریر سندر اور سیلندر بھی
موجود تھے۔ میں خاموش رہا۔ اور دم بخود۔

دوسرے دن پتاجی نے مجھے اپنے ساتھ گاڑی پر چلنے
کو کہا۔ میں بہت گھبرایا کہ آخر یہ مجھے کہاں لے جائیں گے اور
سہما ہوا اونکے ساتھ ہولیا۔ میرے دل کی حرکت بڑی تیز ہوگئی
تھی، خون رگوں میں بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ گاڑی مختلف
گلیوں سے گذرتی ہوئی ایک ایسی گلی میں پہونچی جو مجھے
کچھ آشنا معلوم ہورہی تھی۔ چلتے چلتے گاڑی یکایک رک گئی
پتاجی اترے اور مجھے بھی اترنے کو کہا۔ میں سکتہ کے عالم میں
نگاہیں نیچی کئے کھڑا تھا۔ ہم لوگ اسوقت رام بابو کے مکان
کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ میرے دماغ کا اوسوقت
کیا حال تھا میں بتانے سے قاصر ہوں۔ یہ ایک ایسا
وقت تھا جو کسی انسان کی زندگی میں شاذونادر ہی آتا ہے

اتوار کا دن تھا رام بابو گھر ہی پر تھے۔ پتاجی
کے پکارنے پر وہ باہر آئے اور پتاجی کو دیکھتے ہی

ایسا لپٹ گئے گویا وہ دونوں لنگوٹیا یار تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ رام بابو مجھے دیکھ کر خدا جانے کیا کچھ سوال کریں۔ اچانک کون سا جملہ انکی زبان سے نکل جائے مگر اس کے برخلاف اسوقت اون کے ہونٹوں پر ایک ایسی معنی خیز مسکراہٹ تھی جو سب کچھ بتا رہی تھی۔

ہماری شادی کے بعد ریحانہ نے مجھ سے کہا کہ اوسکے پتاجی، میرے پتاجی، لنڈن، سیلنڈر سب ہی اس رسونیا والے واقعہ کی سازش میں شریک تھے۔ اور یہ سب محض میرے اس "جرم" کی سزا تھی کہ کبھی میں نے شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔

از جناب قادری، ہزاری باغ

یہ کوئی قصہ نہیں، کہانی نہیں، سچے واقعات ہیں۔ افسانہ نویسی آج کل عام بات ہے، بونن کثرت واقعات کے مجموعے ہوتے ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ہر شخص کی زندگی خود ایک ناول ہے عبرتناک، ایک فسانہ ہے سبق آموز۔ کسی کی ٹریجڈی ہے، تو کسی کی کامیڈی۔ سچ تو یہ ہے کہ اصل واقعات میں دلچسپیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور عبرت و موعظت بھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نوع کے سلسلے سے قوم و وطن کی قابل قدر خدمات اور رسوم و رواج کی بہترین اصلاح کی جاسکتی ہے (قادری)

میں ہمیشہ سے ایسا غریب نہ تھا۔ میری پیدائش ایک معزز اور کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی تھی۔ میری کئی بہنیں اس عالم فانی میں آئیں اور چھ ماہ، ایک سال رہ کر آخرت کو سدھار گئیں۔ عرصہ تک والدین اولاد کے لئے ترستے رہے۔ میری پیدائش سے سارے خاندان میں شادمانی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ چار برس تک والدین کی شفقت و محبت کی دنیا میں تنہا رہنا میرے ناز و نعم، لاڈ اور پیار میں کیا کچھ اضافہ نہ کرسکتا تھا۔ اس کے بعد میری دو بہنیں پیدا ہوئیں اور دو بھائی۔ اب ہمارا گھر بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ والدین کی مسرت و شادمانی کا کہنا ہی کیا۔ مگر انکی مسرتیں اور شادمانیاں بے پایاں غم و اندوہ میں تبدیل ہو جاتیں، اگر ہماری قسمت کی تحریروں کو وہ جان سکتے۔ انہیں کیا معلوم کہ اولاد کا مستقبل تیرہ و تار ہوگا یا روشن و تاباں۔ میں مکتب میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ بٹھایا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شاید ہی کوئی رات ایسی گزرجاتی ہو، جس میں والدین مجھے افسانوں کے پیرایہ میں نیک اطواری اور بہترین زندگی گذارنے کا درس استقلال اور بلند حوصلگی کا سبق نہ دیتے ہوں۔ والد مجھے ہمیشہ شام کو اپنے ہمراہ لیکر بغرض تفریح باہر نکل جاتے، اور راستہ بھر مجھے اچھی اچھی کارآمد و مفید باتیں سکھلاتے، اور میں شوق سے انکی باتیں سنتا رہتا۔ کبھی کبھی میں شرارت بھی کر بیٹھتا، جس کی وہ پدرانہ شفقت کے ساتھ سرزنش کرنے میں نہ چوکتے۔ میں مچل جاتا اور کہتا "آپ کی باتیں اب نہ سنونگا۔" وہ "بدمعاش" کہہ کر ہنس دیتے، میں والہانہ شوق سے سرزنش کو بھول کر ان سے لپٹ جاتا، اور وہ مجھے آغوش میں لے لیتے۔ کتنی مسرت زا اور سکون بخش ہوتی تھی وہ آغوش

(۲)

میرے والد کی دوسری شادی تھی - ہم محل ثانی سے تھے - بقول اراکین خاندان کے "میری ماں اعلیٰ خاندان سے نہ تھیں" - جب مجھے کچھ ہوش و حواس ہوا، تو یہ طعن میرے لئے سوہان روح تھا - میں نے اس کی بہت تفتیش کی پر کوئی نقص مجھے ننھیالی خاندان میں نظر نہ آیا، بجز اس کے کہ وہ لوگ ہمارے اجداد کی دولت و ثروت میں ہم پلہ نہ تھے - سماج کی نظروں میں یہ تفاوت کوئی معمولی اہمیت نہیں رکھتا، جو آسانی سے نظر انداز کیا جاسکے - یہ خرابیاں کچھ ایسی تھیں، جو ہمارے ننھیالی خاندان کو "اعلیٰ خاندان" میں شمار ہونے سے سختی کے ساتھ روک رہی تھیں - گو میں چھوٹا تھا، مگر نہ معلوم مجھ میں اتنی سمجھ اور ذہانت کیوں تھی - آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ طعن و تشنیع پیداوار ہے حسد کی، جسے والدہ کی بہترین صفات اور خوبیوں نے خاندان والوں کے دلوں میں پیدا کر دی تھیں - مگر آہ —— ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ آج کی یہ سب زہر آمیز باتیں کسی دن سم قاتل بنکر میری زندگی کو برباد کرنے والی ہونگی - کیا سماج کی یہ سب بندشیں تھیں، جو پیش خیمہ تھیں میرے مستقبل کی تباہ کاریوں کی ؟ کس قدر خطرناک ارادے ہوتے ہیں سماج کے، اور کیسی ہلاکت بار ہوتی ہیں انکی سازشیں -

(۳)

میں اپنی عمر کی نو منزلیں طے کرچکا تھا - فارسی میں اچھی شد بود ہوچکی تھی - میرے چھوٹے خالو کلکتہ میں پولیس لائن میں تھے - ان کا اصرار، والد کے انکار پر غالب رہا - اور وہ مجھے تعلیم کی غرض سے اپنے ساتھ لے گئے - والد میری اعلیٰ تعلیم کے بہت متمنی تھے بہت ردوکد کے بعد یہ سوچکر راضی ہوگئے کہ شہر میں میری تعلیم بہ نسبت دیہات کے حسب خواہ اور میرے ہوش و حواس کے اضافہ میں شہرت کافی اثر انداز ہوسکے گی - میں مٹیا برج کے ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا - کچھ ہی ماہ بعد، والد کے سایۂ عاطفت سے دائمی محروم ہو جانے کی ہوشربا خبر ملی - ایام طفلی نے اس خبر جانکاہ سے چنداں متاثر نہیں ہونے دیا - لیکن پھر بھی دنیائے شفقت میں مجھے ایک کبھی پر نہ ہونے والا خلا سا محسوس ہو رہا تھا - اور یہ احساس شدت کے ساتھ ترقی کرتا گیا، جوں جوں عمر اور کشمکش حیات بڑھتی گئی - میرے والد فارسی کے جید عالم سمجھے جاتے تھے، اور خوشنویسی میں عدیم النظیر - انکی قلمی فارسی تصانیف جن میں اخلاقیات و مذاہب پر بحث کی گئی ہے - ہنوز میرے پاس موجود ہیں - جنہیں ان کی کبھی نہ مٹنے والی یادگار سمجھ کر میں حرز جان بنائے رہتا ہوں - آخر والدہ کے پے بہ پے خطوط اور تار سے مجھے مکان لوٹنا پڑا - یہاں آکر نقشہ ہی کچھ اور دیکھا - ایک برس قبل کی باتیں آج خواب و خیال سی معلوم ہو رہی تھیں - اقربا مجھے دیکھکر، میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے اور دل پر تسلی کا پھایا رکھنے کے بجائے منہ پھیر لیتے تھے - باوجود سمجھنے کی

ہزار کوششوں کے بھی اس رمز کو میں سمجھ نہ سکا۔ یک بیک ایسی اہم و غیر معمولی تبدیلی کیوں ہو گئی؟ وہ لوگ جو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ آج بیزار سے کیوں معلوم ہوتے ہیں؟ اکثر میں اسی پہ غور کرتا رہتا۔ لیکن کسی نتیجہ پر پہنچنا میرے لئے آسان نہ تھا۔ بمشکل ایک سال گزرے ہونگے' والد مرحوم کو دائمی داغ مفارقت دیئے ہوئے اس ابدی جدائی کا ناقابل برداشت صدمہ محو بھی ہونے نہ پایا تھا۔ کہ مجھ پر حقیقت کے کئی ناجائز مقدمات اراکین خاندان کی طرف سے کھڑے کر دئے گئے۔ اف کتنی عجیب تجویز' کتنا ہلاک اقدام تھا' میرے خویش و اقارب کا۔

(۴)

میرا کوئی یار تھا نہ مددگار۔ نگراں تھا نہ سرکار کتنے گراں تھے میرے لئے یہ سب مسائل۔ مقدمے چھلے۔ پیشی پر پیشی ہوتی رہی۔ ایسی بے بسی و بے چارگی میں نتیجہ معلوم۔ مجھے ہزیمتیں اٹھانی پڑیں تباہ کن۔ کافی حصہ اراضیات کا مجھ سے چھین لیا گیا۔ کیا ہمارے اقربا زر اور زمین کو عزیز ترین خون سے زیادہ چاہنے والے تھے؟ میں قرض کے ایک بھاری بوجھ کے نیچے دب گیا۔ عدالتوں میں جھوٹ نہ بولنے کی قسم کھانے کے بعد کس طرح لوگ جھوٹ کو سچ' بنانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں' اس کا مجھے پہلا تجربہ تھا۔ ان سب پریشانیوں اور الجھنوں کے باعث والدہ کی کوشش کے باوجود میں مجبور ہو گیا' والد مرحوم کی انتہائی تمنا کی تکمیل میں۔ ان حالات میں سلسلۂ تعلیم جاری رکھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میرے ایک حقیقی چچا جن کی کوئی اولاد زندہ نہ تھی' اور جو کافی دولت و ثروت کے مالک تھے۔ خدا جانے کیوں ہم سے متنفر اور بیزار سے تھے۔ ان کی ادنی سی ادنی' اعانت اور حمایت سے ہمیں دائمی محرومی کا سامنا رہا۔ ہماری معیبتیں انہیں میری طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہیں۔ شاید میری تباہیاں انکی تفریح و مسرت کا باعث رہی ہوں۔ مجھ پر وہ مصائب و آلام جو نازل ہو چکے تھے بالکل ناکافی تھے' کینہ کی نگاہوں میں' جن کے قلوب مہر و رحم کے جذبات لطیف سے ایسی ہی ناآشنا تھے' جیسے ایک کہنہ مشق جلاد کا سنگین دل۔ سماج مجھے اس حال میں بھی دیکھنا گوارا نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ ہمارا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے ایک اور ترکیب جو ہلاکت آفرینی میں کم نہ تھی' سوچی گئی' جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی' وہ یہ کہ ہم لوگوں کے نابالغ ہونے کا ڈھونگ رچا کر مہاجنوں کو بھڑکانا شروع کر دیا گیا۔ میں روپیہ لاتا کہاں سے جو ادا کرتا' تقاضوں کی بے پناہ شدت سے مجبور ہو کر اونے پونے' مہاجنوں کے حسب منشا' والدہ کی ولایت میں مجھے بقیہ آراضی کو رہن رکھ کر جان چھوڑانی پڑی۔ حالانکہ قانوناً یہ بھی ناجائز تھا' مگر وقتی طور پر میری تباہی کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آہ ۔۔۔ جس قسمت نے اس تمنا کے ساتھ مجھے اس جال میں پھنسایا تھا' کیا وہ

اپنے کھانے کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے دیتی؟

(۵)

میں اپنی پر الم زندگی کے خوفناک اور تاریک ترین دور میں بھٹک رہا تھا۔ جو کچھ زمین بچی بھی تھی۔ اسکی پیداوار کسی نگراں کے نہ ہونے کے باعث اتنی ناکافی ہونے لگی، جس سے گھر کا خرچ چلنا محال ہوتا گیا۔ آخر فاقوں کی نوبت پڑنے لگی۔ فقر و فاقہ اپنے تمام لوازم اور پوری قوت کے ساتھ ہم پر مسلط ہو چکا تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی روز چولھے میں آگ تک نہ جلتی۔ رہی سہی جائداد، و سائرات کے ختم ہو جانے کے بعد اب ہمارا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں بھوک کی شدتوں کو برداشت کر لیتا، مگر ننھے ننھے بھائی، بہنوں کا دانہ کے بغیر بلک بلک کر رونا مجھ سے نہ دیکھا جاتا۔ والدہ کی خودداری نے مجھے بھی خوددار بنا دیا تھا۔ باوجود کئی کئی شام فاقوں سے گزر جانے پر بھی اس کا تذکرہ میں کسی سے نہ کرتا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ میری سمجھ سے باہر تھا۔ آہ وہ واقعہ جو میری زندگی کا سب سے پہلا اور سب سے اخیر تلخ واقعہ تھا، کبھی نہ بھولونگا، جبکہ بھوک کی شدت سے بیقرار ہو کر ایک روز میں مزدوری کرنے کے لئے اپنے چچا کے مزدوروں میں جا ملا۔ وہ ساعت کتنی روح فرسا، اور دل شکن تھی، جبکہ میں بہ یک بینی و دو گوش، مزدوروں کی جماعت سے دھتکار کر نکال دیا گیا۔ کچھ اس لئے نہیں کہ اس جماعت میں میرا شریک ہونا چچا کے لئے ننگ ناموس تھا، بلکہ اس لئے کہ اور مزدوروں کی طرح مجھ میں کام کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ چچا اس نقصان عظیم کو جو میری بدولت ہوتا کیسے برداشت کر سکتے تھے، حالانکہ مزدوری انکو پوری دینی پڑتی۔ یہ خبر والدہ تک جا پہونچی۔ اس دن میں نے ان کو تمام دن از حد مغموم اور روتا پایا۔ کیا انکی مغمومیت اور گریہ کا باعث میں ہوں؟ کیا اسی لئے وہ مجھ سے خفا ہیں؟ میں سوچتا رہا۔ کیونکہ بغیر انکو اطلاع دئے میں مزدوری کرنے چلا گیا تھا۔ انکی یہ حالت میری بیقراریوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ آخر میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنی ہچکیوں کو روکتے ہوئے کہنے لگیں "تم نے جیسا آج مجھے صدمہ پہونچایا، شاید کبھی مجھے ایسا روحی صدمہ نصیب نہ ہوا ہوگا۔ تمہیں مزدوری ہی کرنی تھی سلیم! تو کیا اور جگہ نہ تھی"؟ انکی آواز بیٹھ گئی اور وہ پھوٹ پڑیں۔ میں ندامت کے مارے گردن جھکائے بےحس و حرکت کھڑا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نے والدہ کا دل ہی نہیں دکھایا بلکہ قتل جیسے جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔ شام ہوتے ہوتے میری عجیب حالت ہو گئی۔ سارے جسم میں ایک آگ سی لگی معلوم ہوتی تھی۔ یہ ہمارے فاقہ کا تیسرا دن تھا۔ بھائی بہنوں کی چیخ و پکار، آہ و بکا اور بھی کلیجہ کو برما رہا تھا۔ آخر برداشت کا یارا نہ رہا۔ اور میں نے ایک بہت ہی مذموم حرکت کا ارادہ کر لیا۔ شام ہو چکی تھی۔ والدہ مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے ایک بہت بڑے مرغے کو جو صحن کے ایک گوشہ میں چھپا بیٹھا تھا، چپکے سے پکڑ لیا، اور فوراً اس کا منہ دبا دیا تاکہ بول نہ سکے، اور ایک کپڑے میں چھپا کر (شاید پوسید

ململ کی قمیص تھی جس کو میں نے اتار دیا تھا) قریبی رشتہ کے ایک چچا کے یہاں لے گیا۔ "کہاں تڑکے ہو جی" مجھے دیکھتے ہی ایک عجیب استکراہ کے ساتھ انہوں نے پوچھا۔ "اسکو بیچنے آیا ہوں کیا آپ خریدیں گے؟" میں نے جلدی سے مرغ دکھا کر ان سے دریافت کیا، انہیں میری ہیئت کذائی سے کچھ شبہ ہوا۔ آخر انہوں نے مجھ سے اقرار کرا لیا کہ "یہ میرا نہیں، چوری کرکے لایا ہوں" یہ سنکر وہ تو خود کچھ دیر کے لئے ساکت ہو گئے، شاید اس کے خریدنے کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ کر رہے تھے۔ لیکن انکی اہلیہ نے لپکتے ہوئے کہا۔ "ہاں بیٹا لاؤ، میں لے لونگی۔ مگر کسی سے کہنا نہیں کہ میں نے دام دیا ہے" اسکی تائید ہمارے متقی صورت، بزرگ چچا نے بھی بڑے زوروں سے کی، جن کے ہاتھ میں اسوقت ایک بہت بڑی لمبی تسبیح کانپ رہی تھی۔ "ایک آنہ پیسہ لو مگر خبردار بیٹا کسی سے کہنا مت"۔ چچی نے رازدارانہ تاکید کے ساتھ مرغ کی قیمت دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں نے اسے بہت بڑی دولت سمجھا، خوشی خوشی لیکر واپس آگیا۔ اور والدہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "اس کا کچھ منگا کر ان بچوں کو کھلا دیجئے، جو بھوک سے ہلکان ہو رہے ہیں"! مگر میں نے دیکھا کہ والدہ نے اس پیسے سے اس طرح ہاتھ کھینچا جیسے دہکتا ہوا انگارہ پڑ گیا ہو۔ "تم یہ لائے ہو کہاں سے" والدہ نے خفگی سے پوچھا۔ میں نے کل واقعات من وعن کہہ دئے۔ کہتا کیوں نہیں، مجھے بچپنے ہی سے جھوٹ کی برائیاں اور سچ کی خوبیاں ذہن نشین کرائی گئی تھیں۔ جس کے باعث میرا عقیدہ ہو گیا تھا کہ جھوٹ ایک ناقابل عفو جرم ہے، اور دنیا کی سب سے بدترین معصیت۔ والدہ کے بل کھائے ہوئے تیور سے معاملہ کی نزاکت و اہمیت کا میں احساس کر ہی رہا تھا، کہ مجھ پر برس پڑیں۔ میں ہکا بکا رہ گیا، راست بازی کا ایسا ثمر تلخ پا کر۔ صرف مجھے اتنا خیال ہے کہ چار چھڑی کھانے کے بعد، جو ہماری شومی قسمت سے وہیں پر پڑی ہوئی تھی، میں گر پڑا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے معلوم نہیں۔ آنکھیں کھلیں تو سرہانے والدہ کو روتا ہوا پایا، اور جسم میں کچھ درد سا محسوس ہونے لگا۔ جا بجا سے خون نکل رہا تھا۔ والدہ کہنے لگیں، "بیٹا! اچھے آدمی ایسا کمینہ کام نہیں کیا کرتے، ایسے کاموں سے محترز رہنے کے لئے اگر جانوں کی بازی بھی لگانی پڑے، تو گریز نہ کرنا چاہئے۔ میں نے پیسے واپس کر دئے تھے۔ مگر وہ لوگ مرغ دینے سے انکار کر گئے۔ تم خود جاؤ" میں اسی حالت میں گیا، اور بڑی خوشامد اور منتوں سے لاکھوں صلواتیں سنکر مرغ واپس لایا۔ اسی وقت والدہ نے اس مرغ کو اس کے مالک کے پاس بھجوا دیا۔ آہ، میرے اراکین خاندان کا طرز عمل کتنا خوفناک تھا۔ میں سمجھتا ہوں سوسائٹی مجھے مجبور سمجھتے ہوئے بھی میری اس اضطراری حرکت پر نفرین و ملامت کی تجویز پاس کریگی۔ لیکن با اعلان نفرت کے پہلے اسے سوچنا چاہئے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اور کس کی بدولت؟ اس کی ذمہ داریاں میرے سرمایہ ہونگی یا سماج کے؟ جنہوں نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اف میری یتیمی، کتنی پرمحن اور کیسی پر آلام تھی

(۶)

ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے مگر نہ معلوم مرے مصائب و آلام کی انتہا تھی یا نہیں۔ یک بیک ہم سب کے سب یک وقت چیچک میں مبتلا ہو گئے۔ آہ! مری مصیبتوں کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ دوران مرض میں ہم لوگ جس طرح بے یار و مددگار تیرہ و تار مکان میں پڑے رہتے تھے اس کے حسب تصور ہی سے اب روح کانپنے لگتی ہے کھانا تو نصیب نہیں، روشنی کے لئے تیل کہاں سے آتا۔ اس مرض کا سب سے کم حملہ مجھ پر تھا میں ای حالت میں سب کی تیمارداری و نگرانی کرتا۔ کوئی بھولے سے بھی ہماری عیادت کو نہ آتا۔ اگر ہم مر جاتے تو وہی مکان ہمارا مدفن ہوتا۔ یہ تھی ہمارے سماج اور پڑوسیوں کی انتقامانہ ذہنیت میں عالم بیکسی و تنہائی میں راتوں کی مہیب تاریکی سے گھبرا گھبرا کر چاروں طرف نگاہیں دوڑاتا۔ مگر کوئی ایسا نظر نہ آتا۔ جو رسمی ہمدردی اور مصنوعی دلجوئی کے ساتھ ہی سہی مری ڈھارس بندھاتا۔ دلجوئی کرتا۔ جب سب رو بہ صحت ہونے لگے۔ تو غذا کی ڈھونڈ تھی میں عجب کشمکش میں تھا کوئی چیز ایسی نظر نہ آتی تھی جسے بیچ کر مریضوں کے لئے ایک دو شام کا آذوقہ بہم کر سکوں مجھے اپنی قوت برداشت پر حیرت ہوتی تھی میں ان سب کا ایسا عادی ہو چکا تھا جیسا انسان سانس لینے کا۔ گھر کے ظروف تک بک چکے تھے مٹی کے آبخورے تھے جس میں ہم لوگ پانی پیتے تھے۔ میں جس طرف نگاہیں اٹھاتا پاس ہی پاس تھا۔ خدا جانے ایک غیر شخص کو کیوں مجھ پر رحم آ گیا۔ اس نے بڑی ہمدردی کے ساتھ ایک قسم کا غلہ جسے کوودا کہتے ہیں۔ لا کر دیا۔ یہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک خودرو دوسرا کاشت کیا ہوا ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ وہ خودرو ہی تھا جو سخت نشہ آور ہوتا ہے اور بیہوش کن میں اسکی تمیز نہ کر سکا۔ اور نہ اس کا موقع ہی تھا۔ جان کنی کے عالم میں جو بھوک کی شدت سے تھی ہم لوگ اسکو کھا گئے نصف دن اور ساری رات ہم لوگوں پر بیہوشی کا سخت ترین حملہ رہا۔ دیکھا۔ اس غیر متوقع رحم کے پردے میں کیسی خودغرضی کارفرما تھی؟

(۷)

میں سنتا تھا کہ کلکتہ میں ہر قسم کے لوگوں کی کھپت ہو جاتی ہے اور بہت ہی دولتمند شہر ہے گھر پر رہ کر فاقہ کرتے کرتے زندگی اجیرن ہو رہی تھی اوروں کے چہروں پر سکون و اطمینان کا رنگ چھایا دیکھ کر مجھے رشک ہوتا تھا اور اپنی شدید معاشی کشمکش سوہان روح۔ ان سبھوں کو دیکھ کر میرے دل میں عافیت و آرام کی ناکام آرزوئیں مچل جاتی تھیں۔ جیسے ایک ننھا سا بچہ اپنے دوسرے ہم عمر کی کوئی اچھی چیز دیکھ کر طفلانہ معصومیت کے ساتھ والدین سے اسی چیز کا طالب ہوتا ہے لیکن نہ ملنے پر تو وہ مچل ہی جاتا ہے مگر میں اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ ایسی زندگی میرے حصہ میں نہیں آئی ہے بلکہ مری کشتی حیات تو طوفان و تلاطم کے ملا [illegible] باوجود اپنی ناقابل انگیز مصیبتوں اور فاقہ

ہستیوں کے ہجوم میں زندہ رہنے کی خواہش اور ہمت صرف ایک وجہ سے تھی۔ وہ یہ کہ دکھیا ماں کا خیال۔ جو کبھی غلہ کے انباروں اور سیم و زر کی تھیلیوں سے کھیلا کرتی تھیں۔ جو مصیبت زدہ ہستیوں کو سہارا دیتے، اور ان کی امداد کرنے میں غرض انسانیت کی تکمیل سمجھ کر روحی مسرت محسوس کرتی تھیں۔ آج خود انتہائی مصیبت زدہ ہستی اور بے سہارا تھیں جنکی شکستہ تمنائیں اور برباد شدہ آرزوئیں ہر طرف سے سمٹ کر صرف میری ہستی سے وابستہ ہو گئی تھیں اور جو بھول گئی تھیں۔ افکار و آلام کو مجھے دیکھکر اور مجھے پاکر۔ ورنہ میرا دل بار بار مجھے آمادہ کر دیتا تھا اس ورطۂ غم سے نجات دائمی حاصل کرنے کیلئے جس میں آشوب روزگار نے مجھے بےطرح پھنسا رکھا تھا۔ ایسا محبوب خیال تھا کہ اگر ماں کی غمزدہ اور اشکبار آنکھیں میرے تخیل کے سامنے نہ آ جاتیں تو میں اپنے دل کے مشورہ پر عمل کر گزرتا۔ میرے دل میں اپنے تباہ کرنے والوں سے انتقام لینے کے جذبے رہ رہ کر موجزن ہو جایا کرتے تھے۔ کیا جارحانہ انتقام؟ نہیں بلکہ روپیہ پیدا کر کے اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کرنا۔ میرے نزدیک یہی بہت بڑا انتقام تھا جو کینہ والوں سے لیا جا سکتا تھا چنانچہ میں ایک روز چپ چاپ کلکتہ روانہ ہو گیا۔ ایک مخلص ہمدرد دوست کی امداد سے جس نے مجھے خرچ کے روپے دیئے۔ یہ چار دہ سالہ زندگی کا پہلا دن تھا جو میں نے خود پر ایک صنف نازک کو مہربان پایا۔ جو میرے تباہ کرنے والے خاندان کی ایک لڑکی تھی کیا میں کبھی اپنے اس محسنہ کو بھول سکتا ہوں

جس سے مجھے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کی امداد ملی ہے میں اپنے خیال کے مطابق سمجھ رہا تھا کہ اب قسمت مجھ سے باعزت مفاہمت ہو جائیگی۔ کلکتہ پہونچتے ہی ایک دور کے رشتہ کے ماموں کی وساطت سے ایک کارخانہ میں مجھے بارہ روپیہ کی جگہ مل گئی میں نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی جانفشانی اور محنتوں، اخلاق اور انکسار کی بدولت بہت ترقی کر لی۔ ایک سال بعد میرا مشاہرہ چالیس روپیہ ہو گیا مجھ سے سارا اسٹاف خوش رہتا ہیڈ مستری کو تو میں نے اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا جو مسلمان تھا اور میری خوش نصیبی سے ان پڑھ۔ وہ مجھ سے پڑھنے لگا۔ میری ترقی کا اصلی سبب ہیڈ مستری کا مجھ سے تعلیم پانا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی نوکری سے میں کچھ زیادہ خوش نہ تھا۔ ملازمت سے مجھے ایک نوع کی دائمی نفرت رہی شاید اس وجہ سے کہ اسمیں غیر محسوس طریقہ سے غلامانہ ذہنیت مستحکم ہوتی جاتی ہے اور روح آزادی مردہ۔ نہ معلوم کیوں میرا عقیدہ ہو گیا تھا کہ آزادی اور دولت نوکری سے نہیں بلکہ تجارت سے حاصل کی جا سکتی ہے میرے دل میں بام عروج پر پہونچنے کی آرزوئیں بے تاب ہو رہی تھیں۔ اور میں نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر میری دیرینہ آرزو بر آئی اور میں نے ایک چھوٹی سی دکان مضافات کلکتہ میں سے ایک جگہ کھول دی۔ ناتجربہ کاری کے باعث پریشانیاں اور خسارے ہوتے رہے یکے نقصان مایہ و دیگر شماتت ہمسایہ کا مصداق رہا مگر میں نے ہمت نہ چھوڑی اور بہت ہی جانفشانی اور تندہی سے اسمیں منہمک رہا۔

(۸)

میرے ایام مصائب کے اختتام کی ساعتیں شاید ابھی دور تھیں قسمت میری تدبیروں کا مضحکہ اڑا رہی تھی میری خوش طالعی ہم نوائی و ہم آہنگی سے گریزاں تھی کچھ اسباب ایسے رونما ہوگئے جن کے باعث کلکتہ کے تجارتی کاروبار کو ترک کرکے مجھے مکان آجانا پڑا۔ ناتجربہ کاری کے ساتھ ہڑتال اور گولی چلنے کے واقعات نے جو سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کا نتیجہ تھے مجھے کافی زک پہنچائے مگر یہ ناکامیاں میرے عزم و استقلال کو ڈگمگا نہ سکیں۔ میری امنگیں اور ارادے اس حوصلہ شکن واقعہ سے مضمحل نہ ہو سکیں مصائب و آلام سے نجات حاصل کرنے کا دھن جنون کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ میں نے مکان ہی پر محض تھوڑے سرمایہ سے جو چالیس روپیہ کے لگ بھگ تھا پھر تجارت شروع کردی اور اسکو کامیاب بنانے کے لئے میں نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کردیا۔ اس دفعہ میری کوششیں رائیگاں نہ گئیں۔ چند سال کے اندر میرا سرمایہ تین ہزار تک پہونچ چکا تھا اس حیرت انگیز کامیابی پر مجھے روحانی مسرت ہوتی تھی یہ اندازہ کرکے کہ اب میری کشتی حیات گردش کے ہلاکت آفریں بھنور سے ساحل امن کی طرف تدریج آرہی ہے۔ میرے حسن اخلاق اور رواداریوں سے ہر شخص متاثر تھا۔ اب میں دیکھ رہا تھا اپنے خویش و اقارب کو جو اب مجھے احد عزیز سمجھنے لگے تھے اور مجھے ایک حیرت سی ہوتی تھی میں ان لوگوں کے ساتھ ناروا برتاؤ اور تباہ کن سلوک کو فراموش کر چکا تھا۔ اور وہی قدر و منزلت، عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا جسکے وہ مستحق تھے۔ مگر آہ مسرت کتنی غیر پائدار نکلی۔ دریائے مصائب میں اپنی کشتی حیات کو ابھی کھیتے اور کھینا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ قدرت کی ستم ظریفیاں اتنی جلد میری مسرت کو پامالی سے ہمکنار کردینگی اور قسمت پھر مجھے قعر ہلاکت میں ڈھکیل دے گی ـــ انسان اپنے مستقبل سے کتنا لاعلم ہوتا ہے وہ نہیں جانتا کہ آنے والی ساعتیں اپنے دامن میں کیسی مصیبتیں کیسی فلاکتیں، یا کیسی راحتیں، کیسی مسرتیں چھپائے ہوئے ہیں۔ کاش وہ جان سکتا اف۔۔۔

میں پھر بری طرح تباہ ہوگیا بہار کے زلزلہ عظیم ۱۹۳۴ء کی تباہ کاریوں سے جو شخص صعوبت زا اور دشوار گذار گھاٹیوں کو سخت جدوجہد اور جانفشانیوں کے ساتھ عبور کرکے منزل مقصود کو قریب آتا دیکھکر والہانہ تیزی سے اسکی طرف بڑھ رہا ہو۔ اور قریب تر پہونچکر حوادث کے بے پناہ حملوں سے پسپا ہوجائے ایسا کہ ہوش سنبھالنے کی صلاحیت باقی نہ رہے اس کیلئے یہ کیسا اندوہ ناک اور کیسا جاں گسل حادثہ ہوگا؟ جان کے سوا ہمارے کوئی چیز نہ بچی غم اور پریشانیوں میں مبتلا کوڑی کوڑی کا محتاج ہوگیا۔ یہ مصیبت ماضی سے زیادہ گراں معلوم ہوتی تھی شاید اس وجہ سے کہ اب مجھ میں قوت حس بہت ترقی کرگئی تھی۔ میرا دماغ مختل ہوگیا۔ کیا ہوگیا؟ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کیا ایک خواب تھا شیریں جسکی تعبیر اس رنج و یاس کی صورت میں ملی؟ مجھے چاروں سمت

ہماری ہی تاریکی نظر آ رہی تھی لیکن ان ناقابل برداشت نقصانیوں کا کوئی ناخوشگوار اثر مجھ پر مرتب نہ ہو سکا۔ چونکہ میں بچپنے ہی سے مصیبتوں کے جھیلنے اور سختیوں کے برداشت کرنیکا خوگر ہو چکا تھا۔ کٹھن سے کٹھن مشکلوں، اور سخت سے سخت تکلیفوں کو راحت و آرام محسوس کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ میرے کچھ ایام بہت ہی کشمکش اور دشواریوں میں گزرے۔ یہ ناگہانی مصیبت مجھے بے گھر اور بے زر کرنے میں کامیاب تو ہو گئی۔ مگر میری ہمتوں کو شکستہ اور میرے استقلال کو تباہ نہ کر سکی۔ میں نے ملازمت اختیار کر لی کیونکہ سرمایہ کی فراہمی بغیر اس کے اب ممکن نہ تھی۔ کچھ دنوں بعد میں نے تجارت میں پھر قدم ڈال دیا۔ بہت سی ضروریات زندگی کو ترک کیا۔ اور بہت سی رکاوٹوں کو ہٹاتا ہوا پورے استقلال اور پامردی کے ساتھ آشوب روزگار کا مقابلہ کرتا ہوا، اپنی دائمی بے آرام حالات کی تبدیلی میں عزم آہنی کے ساتھ مصروف پیکار ہوں۔ میرے ذہن میں یہ بات یقین کے ساتھ بیٹھ گئی ہے کہ ہر تخریب ایک بہترین تعمیر کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ کیا عجب میرے برے ایام ختم ہونے والے ہوں۔ اور مصائب و آلام کے وہ سیاہ بادل جو عرصہ دراز سے مجھ پر منڈلا رہے ہیں۔ صاف ہو جائیں۔

از جناب سید اختر احمد صاحب اختر اورینوی ایم اے لکچرر پٹنہ کالج

اُسے ہر راہگیر جانتا تھا۔ شام سویرے وہ بانکی پور کی سڑکوں پہ یا گلیوں میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آجاتی تھی۔ وہ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بیٹھی بیٹھی گھسک کر چلتی تھی یا گڑو بیٹھی ہوئی۔ وہ ایں بائیں ہلتی جاتی تھی کلاک کے پنڈولم کی طرح وہ ہلتی جاتی تھی اور اس طرح ناقابلِ محسوس طور پہ آگے بڑھتی رہتی تھی۔ اسی اُکتا دینے والی جنبش کے ذریعہ وہ گلیوں اور سڑکوں کی خاک چھان لیتی تھی۔ راہی اُسے دیکھتے ہوئے یا نظر انداز کرتے ہوئے گذر جاتے تھے، یکے بگھیاں، فٹن رکشے اور بیل گاڑیاں اس کے پہلو سے گذرتی رہتی تھیں اور وہ گھڑی کی سوئی کی طرح عمرِ رواں کی مثال آہستہ مگر یقینی طور پر آگے بڑھتی جاتی تھی، کچھ زیرِ لب گاتی ہوئی، ناقابلِ فہم انداز میں گنگناتی ہوئی۔ کون جانے وہ کیا گاتی تھی۔ دکھ کے گیت یا مٹے ہوئے سکھ کا راگ۔

وہ سڑک یا گلی کے کنارے گھسکتی جاتی تھی اور اس کے پہلو میں نالے کا پانی، خس و خاشاک لئے، اینٹ روڑے سے اٹکتا، سرسراتا ہوا، بہتا جاتا تھا، اوسی بوڑھی، تباہ حال، زمانے کی ٹھکرائی ہوئی فقیرن کی زندگی کی طرح۔

مجہول، اپاہج، بوڑھی فقیرن شاید اندھی تو نہ تھی مگر میں اُسکی آنکھیں کبھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور پپنیاں ایک دوسرے سے الجھی رہتی تھیں۔ وہ ہماری سماج کی طرح اندھی تھی۔ آنکھ رکھ کر اندھی، بیمار، بیکار آنکھیں، اُس کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے اور اُس کے پاؤں میں چیتھڑے لپٹے رہتے تھے۔ اُس کا باس صرف رودی ہی نہ رہتا تھا بلکہ اکثر وہ آدھی ننگی ہی ہوتی تھی، نہیں ننگی سے بڑھکر ننگی کیونکہ بدحالی میں بیشتر اس کے جسم کے وہ حصے عریاں رہتے تھے جنہیں مستور ہونا چاہئے اور وہ حصے برے بھلے چھپے رہتے تھے جن کے پوشیدہ رہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

وہ کسی سے بھیک نہیں مانگتی تھی بلکہ اپنے حال میں گرفتار گٹھری بنی ہوئی ہلتی جلتی گنگناتی آہستہ، بہت آہستہ آگے بڑھتی جاتی تھی۔ دن بھر میں وہ گلیوں اور بھرے بازار کا سفر کر لیتی تھی۔ اُسے بہت کم بھیک ملتی تھی۔ فقیرن کے حال کی یکسانی ایسی روزانہ کی بات ہو گئی تھی کہ لوگوں کی توجہ بھی اس طرف نہیں پھرتی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں سوچتا کہ اسکی زندگی میں کیا کشش ہو کہ وہ جئے جاتی ہے۔ اس کے جینے کا کیا سہارا ہے،

میری سمجھ میں نہ آتا۔ بے مقصد زندگی، زندگی نہیں، زندگی کی تہمت ہے۔ فقیرن کی زندگی بے کیف، بے آسرا، پھیکی اور سپاٹ ہی نہ تھی بلکہ دکھ درد اور روگ سے بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ جیئے جاتی تھی، وہ زندہ رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں حرکتِ پیہم تھی، استقلال تھا۔ شاید جینا خود ایک مقصد ہے۔

بوڑھی فقیرن، سبزی باغ میں گوبھی کی ڈنٹھل، کرم کلّے کے پتے، سڑے ہوئے شلجم، کچلے ہوئے ولایتی بینگن اور دانہ دار آلو سڑک پر سے جمع کر لیتی تھی اور پھر اُسی جنبشِ پیہم کے ساتھ اپنی راہ لگتی تھی۔ عدالت کے ہوٹلوں کے سامنے وہ چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹیوں کے کنارے چن لیتی تھی۔ بھوکے بازاری کتے اُس سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ اُس پر بھونکتے نہ تھے۔ شاید وہ فقیرن کو اپنا جائز حصہ دار سمجھتے تھے۔ مگر کوئی نیا آوارہ کتا جو اُدھر آ نکلتا تو فقیرن کا ہاتھ ضرور اُس کے پنجوں سے مجروح ہو جاتا اور لباس زیادہ تار تار ہو ———

یہ اپاہج بھکارن سرِ راہ کسی مہترانی یا کسی بوڑھے مزدور کو کبھی کبھار اپنی جیون کہانی سناتی ہوئی پائی جاتی۔ میں نے بھی ایک بار وہ کہانی سنی ہے۔ کہانی بہت ہی مختصر ہے ———

وہ ایک بوڑھے فقیر کی بیٹی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ اسی شہر میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ دن بھیک مانگتے گذر جاتے اور راتیں ٹکڑی کچہری کے برآمدے یا کسی پیپل کے درخت تلے بسر ہو جاتیں۔ پہرہ دار انہیں بہت ستاتے تھے۔ گرمی کی راتیں تو کھلے میدان میں گذاری جا سکتی ہیں، مگر برسات اور جاڑے کی راتیں بڑی بیرن ہوتی ہیں۔ انہیں دشمن راتوں کو کاٹنے کے لئے کسی پناہ کی جگہ کی ضرورت ہوتی۔ پہرہ داروں کو کچھ دے دلا کر ایسی جائے امن میسر آ جاتی تھی۔ وہ اب جوان ہو چلی تھی اور زندگی کے دکھوں کو زیادہ محسوس کرنے لگی تھی، کبھی کبھی وہ جوانی کے سنہرے خواب دیکھتی اور ترس ترس کر رہ جاتی۔ کچھ دنوں سے ایک نوجوان پہرہ دار ان پر بہت مہربان تھا۔ وہ بغیر پیسے لئے انہیں کچہری کے برآمدے میں سونے کی اجازت دے دیتا تھا۔ اور گاہے گاہے رات گئے ان کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ وہ انہیں اپنی دلاوری اور جیالے پن کے قصے سناتا تھا۔ چوروں کو پکڑنے کے قصے، ڈکیتوں کو گرفتار کرنے کے واقعات، بلووں میں گولیاں چلانے کے واردات۔ فقیرن پہرہ دار سے مانوس ہوتی جاتی تھی اور جب کبھی وہ پہرہ کی تبدیلی کے سبب نہ آتا تو وہ اداس رہتی اور اسکی راتیں بڑی بے چین کٹتیں۔ بھری برسات کی ایک سسکتی ہوئی ظالم رات کو فقیرن کی جوانی کا سہانا خواب حقیقتِ عریاں بن گیا۔ وہ دن بڑے مزے میں کٹ رہے تھے۔ چند مہینوں کے بعد پہرہ دار کہیں چلا گیا اور فقیرن اس کا انتظار کرتی کرتی تھک کر بے آس ہو گئی۔ اب وہ ماں بننے والی تھی۔ مگر ان فکر و مسرت کے دو جیسے دنوں میں کوئی اسکی دل دہی

کرنے والا نہ تھا۔ ہونے والی بات اب کے جو دوسرا پہرہ دار آیا تو اُس نے جاڑے کے ٹھٹھرے ہوئے ایام میں فقیرن اور اُسکے بوڑھے باپ کو کچہری کے برآمدے سے نکال دیا۔ بے آسرا ہو کر وہ لوگ درخت کے نیچے رین بسیرا کرنے لگے۔ کیسا پاپی تھا پہرہ دار۔ فقیرن کو اپنا "دیا تو" پہرہ دار یاد آجاتا مگر وہ بھی تو زر موتی ہی نکلا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ فقیرن کے باپ کو نمونیہ ہو گیا اور وہ چل بسا۔ اس بے تھاہ جگ میں اس اندھی نگری میں اُسے تنہا چھوڑ کر وہ رخصت ہو گیا نکلتے جاڑے میں فقیرن کو ست ماسو بچہ پیدا ہوا اُسی درخت کے نیچے جہاں وہ رہتی تھی۔ تیسرے روز بچہ مر گیا اور ہفتہ کے اندر اندر فقیرن کو کمر سے نیچے فالج آگیا۔ اُسی روز سے وہ نگوڑی "نپا نگر" ہو گئی اور اب اس کا یہ حال تھا۔

اپنا دکھڑا سنا کر فقیرن رونے لگتی تھی۔ اُس کے آنسو ٹوٹتے ہوئے تاروں کی طرح دھول میں گر کر اُنکاں ہو جاتے تھے۔ قصہ سننے والے محض بے معنی ہمدردی سے فقیرن کو دیکھتے ہوئے گذر جاتے اور وہ پھر شکستہ امید کی طرح کانپتی ہوئی رہ نوردی کے لئے آگے بڑھنے کی ایک ناتواں سی کوشش کرتی۔

میں اُس فقیرن کو روزانہ دیکھتا تھا اور میرے دل میں ایک مبہم سا جذبہ جستجو پیدا ہوتا تھا کہ وہ اندنوں کہاں رہتی ہے اور کیونکر۔ ایک شام کو میں بھنور پر گھر جا رہا تھا کہ میں نے اُس مفلوج بھکارن کو سبزی باغ سے لوٹتے ہوئے دیکھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو کر رات بننے والا

تھی۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ اب اپنی قیام گاہ کو واپس جا رہی ہے۔ میں وحید خلیفہ کی دوکان پر ٹھہر گیا تاکہ بھکارن آگے بڑھ لے۔ مجھے بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ میں دوکان سے اٹھا اور آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ مجبور بڑھیا ابھی تک صرف ایک موڑ طے کر سکی ہے۔ وہ گھسٹ کر آہستہ آہستہ گھسک رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیوں کی طرح آہستہ۔ میں اگلی موڑ پر ایک دواخانہ میں چلا گیا اور بہت دیر تک دوا فروش سے بے تکی باتیں کرتا رہا۔ میں نے دواؤں کی قیمتیں دریافت کیں۔ اُن کے فوائد سے بحث کی۔ انگریزی اور ہندوستانی دواؤں کا مقابلہ و موازنہ کیا اور سارے شہر کے طبیبوں پر تبصرہ کر ڈالا اور آخر کار سیاست حاضرہ پر لوگوں سے الجھ پڑا تاکہ وقت کٹے۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آج میں بھکارن کے سر چھپانے کی جگہ کو ضرور دیکھ لونگا۔

جب میں دواخانہ سے نکلا تو سامنے کی سڑک پر دوسری موڑ تک بڑھیا نہ تھی۔ میں موڑ تک گیا۔ بھنور پر کمرشلی سڑک پر بھی فقیرن نہ تھی۔ میں حیران حیران اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک پلے کے بھونکنے کی آواز نے میری توجہ اُس طرف منعطف کرائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مجبور و معذور بھکارن ایک چھپریل میں جو ایک مکان کی پشت سے لگی ہوا تھا داخل ہو رہی ہے اور ملی دیکر ایک کتے کا چھوٹا سا پلہ چلا کر دیکھے دیکھے بھونک رہا ہے۔ پلہ کھونٹی سے چھپریل میں بندھا ہوا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی چھپریل موڑ کے پاس پرنالے والی گلی میں دو شکستہ بانسوں پر پڑی ہوئی تھی۔

چاروں طرف کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا اور پرنالے کا پانی رُک رُک کر بہ رہا تھا۔ دو طرفہ مکانوں کی موریاں اُسی گلی میں آکر گرتی تھیں۔ بھکارن چھپریل میں داخل ہوئی پلّے کے پاس پہنچی اور اپنی ساری کے آنچل سے بندھی ہوئی ہڈیاں اس کے سامنے کھولدیں۔ پلّا غرّاتا ہوا بوڑھیا کے آنچل سے ہڈیاں کھاتا رہا۔ فقیرن نے دوسری پوٹری سے روٹیوں کے کنارے نکال کر پلّے کو منہ اور خود اُس سے پیار کی باتیں بولتی رہی۔ میں کھڑا ہوا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ جب بھکارن پلّے کو کھلا چکی تو اُس نے خود کچھ کنارے کھائے اور اس کے بعد پلّے کو کھونٹی سے کھول کر گود میں لے لیا اور بچھی ہوئی پیال پہ جاکر اُسے پہلو میں لئے لیٹ گئی۔ بھکارن کچھ لوریاں سی گاتی جارہی تھی اور پلّا آغوش کی گرمی کے مزے لیتا ہوا غوں غوں کر رہا تھا۔

میں یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ شاید یہ پلّا ہی بے آسرا بھکارن کے جینے کا سہارا ہے۔

از جناب رشید احمد صاحب صدیقی ایم۔اے (علیگ) پروفیسر مسلم یونیورسٹی

(یہ تقریر ۱۳ جنوری ۱۹۳۹ء کی شب میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی۔)

جی ہاں اب میں تقریر کروں گا، جس کے بول ہیں

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

ممکن ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ایسے ہی لیڈر ہوتے ہوں، لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے، اور کچھ اس طور پر بدلا ہے کہ اس شعر کی مزید تشریح جان جوکھوں سے کم نہیں۔ شعر کتنا بوتا ہوا ہے، خصوصاً ریڈیو پر۔ . . . . . .

میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ اس زمانہ میں لیڈر کا تخیل ذرا بدل گیا ہے۔ اب زلیخا خود لیڈر ہے اور برادران یوسف بر سر اقتدار، پھر نسیم مصر کو پیر کنعاں کی ہوا خواہی مدنظر رہی ہو یا نہیں۔ . . . . . .

میرا خیال ہے کہ جس قوم میں جتنے لیڈر ہوتے ہیں اتنی ہی اُس قوم کی شامت متیقن ہوتی ہے۔ اسی دسمبر میں کتنی کانفرنسیں، کتنی انجمنیں، کتنی سبھائیں اور کتنے لیڈر ومدار ستاروں کی مانند فضائے سیاست میں نمودار ہوئے اور کتنے نجومیوں کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی کہ ان ستاروں کی دم سے ٹکرا کر یہ دنیا پاش پاش ہو جائے گی۔ اتنا البتہ معلوم ہوا کہ بجائے کرۂ ارض سے ٹکرانے کے ان ستاروں کی دمیں خود ایک دوسرے سے الجھ کر تتر بتر ہو گئیں اور ہم اور ہماری دنیا جہاں کی تہاں رہ گئی۔ یہ تو اخباری لیڈر تھے جن کے نام مشہور ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ وہ ہیں جن کو نہ اخبارات میں کبھی جگہ ملی نہ جیل میں۔ لیکن وہ اپنے مخصوص حلقہ میں اپنی اہمیت و سمیت پھیلاتے رہتے ہیں۔

لیڈروں کی اقسام متعین نہیں ہو سکی ہیں۔ بعض وصفی ہوتے ہیں۔ بعض ذیلی، بعض مادر زاد ہوتے ہیں، بعض اللہ واسطے، کچھ وبائی ہوتے ہیں، بعض تخلّی ہوتے ہیں، بعض خود کاشت اور بعض شرح معین۔ بعض اشتہاری ہوتے ہیں اور بعض خاموش، بعض ایسے لیڈر رہتے ہیں جن کی صحت خراب ہوتی ہے، چنانچہ وہ ہمیشہ اپنی بیماری اور لیڈری کا ساتھ ساتھ اعلان کرتے ہیں اور اس طرح خرابی صحت کی تلافی شہرت مرض سے کرتے ہیں۔ بعض لیڈر در لیڈر ہوتے ہیں وہ گمراہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ گمراہ رہنے کی بھی کوشش کرتے رہتے ہیں!

میں نے ان لیڈروں کی اقسام بتانے میں بظاہر

کسی قدر طوالت سے کام لیا ہے لیکن آپ یقین رکھئے یہ فہرست قطعاً جامع نہیں ہے۔ لیڈروں کی اقسام اور ہندوستان کے امراض کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔ گو امراض و لیڈر میں ایک فرق بھی ہے۔

امراض کا احساس ہم اسی وقت کرتے ہیں جب ہم اُن میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ بہت سے ایسے جراثیم ہیں جو صرف "حقیقت منتظر" ہیں "لباسِ مجاز" میں نہیں آئے ہوتے۔ لیڈر پھر لیڈر ہے۔ وہ صرف لباس مجاز کا قائل ہے۔ منتظر یا غیر منتظر کے امکان یا عدم امکان کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ وہ یورپ کے تجارتی اصول کا قائل ہوتا ہے۔ یعنی ضرورت پہلے پیدا کی جائے اور مال بعد میں، اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں لیڈر کا موجود ہونا ضروری ہے اس کی ضرورت بعد میں پیدا ہوتی رہے گی۔ ورنہ اسے اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضرورت پیدا ہو جائے اور لیڈر غیر حاضر ہو۔ اسلحہ جنگ موجود ہونا چاہئے۔ لڑائی چھڑنے میں کتنی دیر لگتی ہے!

اب لیڈروں میں سے بعض کا حال سنئے۔ میں نے ایک قسم فصلی لیڈر کی بتائی تھی، یہ لیڈر فصل کی پیداوار کی مانند ہوتا ہے، جس طرح برسات میں کیچوے کنکھجورے، بیر بہوٹی، اور بھنگے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح خاص خاص فصل میں فصلی لیڈر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بقر عید، محرم، دسہرہ، دیوالی کے زمانہ میں آپ دیکھیں گے ہر جگہ مارنے مرنے کے لئے لیڈر رونما ہو جاتے ہیں۔ مارنے مرنے کا لفظ محض برسبیل تذکرہ آگیا ہے اور یہ محض لیڈر کی آمد سے متعلق ہے خود لیڈر کے مارنے مرنے سے اس کا بہت کم علاقہ ہے۔ اصلی لیڈر نہ مار کھاتا ہے اور نہ مرنا گوارا کرتا ہے۔ لیڈر مار کھانا شروع کر دے تو پھر قوم کی رہبری کون کرے۔ مار کھانا اور رہبری کرنا دونوں کام ایک ہی لیڈر سے کیونکر سرانجام پا سکتے ہیں۔ دستور یہی چلا آتا ہے کہ مار کھانا قوم کا حق ہے اور مار سے بچنا لیڈر کا فرض!

ذیلی لیڈر فصل، مقام اور وقت سب سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہ بجائے خود لیڈر نہیں ہوتے بلکہ لیڈروں کے مصاحب ہوتے ہیں۔ جلوس میں ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور ڈائس پر صدر کی کرسی کے قریب یا میز کے نیچے بیٹھے رہتے ہیں، ہار پہننے میں لیڈر کے ساتھ اور نعرہ لگانے میں مجمع کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جب لیڈر جیل خانہ جاتا ہے تو یہ اپنے گھر آ جاتے ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو یا کیسی ہی بات ہو یا اُسے اپنا لیں گے، کسی قدر سنجیدہ اور رونی صورت بنائے ہوئے ہر شخص سے ملیں گے اور اس طور پر تبادلہ خیالات کریں گے گویا مسئلہ کے انجام سے خود ان کا انجام وابستہ ہے۔ سارے قریہ میں کوئی مسئلہ پیش آنے والا ہو یا ماما کی بچی کو چیچک کا ٹیکہ لگایا جانے والا ہو وہ دونوں باتوں پر اسی فکر و تدبر، خشوع و خضوع سے ہر جگہ بیٹھ کر گفتگو کریں گے جیسے خود انہیں اپنے بارے میں طے کرنا ہے کہ شادی کریں یا خودکشی!

لیڈر اپنی دانست میں قوم کی رہبری کرتا ہو یا نہ کرتا ہو اور یہ اپنی دانست میں لیڈر کی رہبری کرتے ہیں۔

گشتی لیڈر وں کی مثال ان بڑھیوں کی ہے جنھوں نے صبح ہوتے ہی اوزار بسولے ساتھ لئے اور کام ہے کام کا پکارتے گھر سے نکل پڑے۔ کسی کی چارپائی کی چول درست کردی۔ کسی کے دبلے کی مرمت کر دی اور کچھ نہ ملا تو جنگل سے لکڑیاں کاٹ لائے۔ پولیس والوں نے دھر اتو ساری لکڑیاں اور نصف اوزار انکی نذر کر دئے۔ اور گھر لوٹ آئے۔ آپ نے بعض کن میلیوں کو دیکھا ہوگا اُس کی گھیر دار پگڑی اور سلائی چپٹیاں یعنی کسی درخت کی جڑ پر یا پلیٹ فارم کے کسی گوشہ میں بیٹھے کان میں خلال کر رہے ہیں۔ خلال اپنی کان دوسرے کا۔ انکی صدائیں بھی آپنے سنی ہوں گی۔ میں نے بھی سنی ہیں۔ لیکن دہراتا نہیں چاہتا غالب نے ایک جگہ انھیں "گشتی لیڈر" کو مد نظر رکھکر شاید کہا ہے

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

اس قسم کے لیڈروں کی کمی نہیں ہے اور وہ دن بھی دور نہیں ہے جب قوم و ملک میں آپ ان کو اسطرح عام دیکھیں گے۔ جیسے شہروں میں جا بجا عرائض نویس مونگ پھلی والے رمال، موچی اور پنیرے ملتے ہیں۔

مادر زاد لیڈر۔ مادر زاد لیڈر اندھے کی مانند ہوتا ہے اس کو کچھ نہیں معلوم صورت حال کیا ہے اس کو شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ صورت حال کیا ہونی چاہئے وہ صرف "ہونا چاہئے" کے درپے ہوتا ہے اُسے نہیں معلوم خوبصورتی کسے کہتے ہیں بدصورتی کیا ہے، وہ صورت ہی کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ وہ زندگی کی کتاب میں فصل پیدا کرنا چاہتا ہے تفصیل سے اُسے سروکار نہیں وہ دیکھے بغیر سمجھنا چاہتا ہے اور یہی نہیں بلکہ سیکھے بغیر کرنا چاہتا ہے ہر واقعہ کو وہ انقلاب یا ہنگامہ کا پیش خیمہ سمجھتا ہے وہ پیش خیمہ کا بھی نہیں قائل ہے وہ صرف حادثہ پایان رکھتا ہے وہ زندگی کے تسلسل اور تسلسل کے حسن و مقصد کو سمجھنے سے قاصر ہے وہ گہرائیوں اور پنہائیوں سے بے خبر ہوتا ہے وہ صرف انتشار و ہیجان سے سروکار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ کھیلنا چاہتا ہے سنوارنا نہیں گوارا کرتا وہ نفی کا قائل ہے حقائق سے گریز کرتا ہے لیکن ذرا ٹھہریئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آپ سوچتے ہوں گے۔ لیڈر کے سلسلہ میں یہ طوفان تکلم کہاں سے چھڑ گیا۔ اچھا "مادر زاد لیڈر" کے یہ معنی سمجھ لیجئے۔ ۲۴ گھنٹے لیڈر آپ نے بعض حاکموں اور افسروں کو دیکھا ہوگا جو ۲۴ گھنٹے حاکم یا افسر بنے رہتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ بیوی بچوں۔ دوست احباب اور بیلے مانسوں میں بیٹھ کر کبھی کبھی ان بلندیوں سے اتر بھی آنا چاہئے جن پر ان کی شامت اعمال نے انھیں پہنچا دیا ہے۔

اللہ واسطے لیڈر۔ وہ ہیں جن کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے صرف دوزخ کی بشارت دینے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے اُس کا عقیدہ ہے کہ صرف وہ جنتی ہے اور بقیہ دوزخی وہ یہ

سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا اور اس میں رہنے بسنے والوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ جنت و جہنم کا پروپگنڈا ہوتا ہے۔ یہ لیڈر گمراہوں سے التفات کم کرتے گا۔ اس کی وجہ تو یہ سبب ہے کہ خود گمراہ اس سے مطلق التفات نہیں کرتے اور کچھ یہ کہ وہ سمجھتا ہے کہیں یہ گمراہ راہ راست پر آگئے تو جنت کے حقدار ہو جائیں گے۔ اور خواہ مخواہ جنت میں طعام و قیام کی دقت محسوس ہوگی۔ وہ خدا اور اس کی لامحدود اور بہت سی نامعلوم قدرتوں کو ریلوے کمپنی کی مانند سمجھتا ہے جہاں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے محدود ہوتے ہیں اگر مسافر زیادہ ہوئے تو ان ڈبوں میں اُسے تکلیف ہونے لگے گی۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ انسان نے خدا کو نہیں پیدا کیا ہے بلکہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا ہمارے افعال سے متاثر ہونے پر مجبور نہیں ہے اپنی منشاء کا مختار ہے جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُس کا شاہکار بس انسان ہیں نہ کہ جنت و دوزخ۔ منشاء الٰہی کون سمجھ سکتا ہے لیکن اتنا مسلم ہے کہ اعمال، انسانی منشاء و مشیت الٰہی کی میزان میں تولے جائیں گے۔ ہماری آپ کی میزان میں نہیں اور بھلے مانسوں کی تقویت کے لئے یہ تصور کافی ہے۔

وبائی لیڈر وہ ہیں جن کے آنے سے کچھ دیر یا دنوں کے لئے اچھے خاصے بھلے چنگے لوگ اچھلنے کودنے چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ ان کا اثر مقامی ہوتا ہے۔ کہیں کہیں اب بھی وبائی امراض کا مقابلہ جھینٹ اور چڑھاوے سے کیا جاتا ہے۔ ان لیڈروں کو چندے اور دعوتوں سے قابو میں لایا جاتا ہے۔ بعض امراض میں تیز دوائیں یا شدید تدابیر سے کام لینا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے بلکہ ان کا دفعیہ اچھی غذا، اچھے لباس اور اچھی فضا سے کیا جاتا ہے۔

جدید ترین تحقیقات کی رو سے بھی امراض کا تدارک انہیں باتوں سے کرنا زیادہ بہتر سمجھا گیا ہے۔ وبائی لیڈروں کا انسداد بھی نہایت آسانی اور کامیابی سے کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ان کے لئے بھی اچھی غذا، اچھا لباس اور تفریحی سیر و سیاحت کا معقول انتظام کر دیا جائے۔

شکمی خود کاشت اور شرح معین لیڈروں میں اب بڑا انقلاب ہو گیا ہے۔ زراعتی اصلاحات نے شکمی اور خود کاشت کو شرح معین کی حیثیت دیدی ہے، اب ان کا بیدخل کیا جانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس میں فائدہ یا نقصان صرف اتنا ہے کہ زمیندار معزول ہو گئے ہیں زمینداری قائم ہے اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ لیڈر معزول ہو گئے ہیں لیڈری قائم ہے۔

خاموش لیڈر بڑا پس بھرا ہوتا ہے وہ کبھی کھل کر بات نہیں کرتا، بحث کرنے کی اس میں جرأت نہیں ہوتی محض اس وجہ سے کہ کہیں اس کے دل کی بات نہ ظاہر ہو جائے اکثر وہ آپ سے زبانی اتفاق بھی کرنے گا لیکن اخبار میں ہمیشہ اختلاف کرے گا۔ وہ شکل، حرکات و سکنات سے اپنے آپ کو بے وقوف و مریض ظاہر کریگا۔ اور واقعتاً وہ ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن اس کا مقصد

صرف یہ جتانا ہوتا ہے کہ محض قوم و مذہب کی خاطر اس نے اپنے آپ کو مجہول بنا رکھا ہے۔ اور قوم و مذہب کی خدمت صرف رونی صورت اور میلے کچیلے کپڑوں سے کی جا سکتی ہے۔

ایک دو میرے بزرگ "مضمون خواں لیڈر" ہیں۔ ان سے کسی مسئلہ پر گفتگو کیجئے وہ ہمیشہ کہیں گے میں نے اس پر مضمون لکھ دیا ہے جلسہ کرا دیجئے تو پڑھ دوں۔ یہ گفتگو نہیں کرتے ہیں انٹرویو دیتے ہیں اور انٹرویو بھی انہیں کو دیتے ہیں جو اسے شائع کرنے پر آمادہ ہوں۔ اور یہی نہیں بلکہ سوال اور جواب دونوں خود تصنیف فرماتے ہیں آپ کوئی سوال کریں جواب یہ وہی دیں گے جو ان کے مضمون میں درج ہو۔ اگر درج نہ ہوگا تو پھر آپ کے سوال کا جواب وہ دیں گے جو کسی بڑے آدمی کو کسی دوسرے سوال پر دے چکے ہوں گے۔ آپ میں ہمت ہو اور پھر کوئی سوال کر بیٹھیں تو ان کا جواب کسی ایسے واقعہ کا اظہار ہوگا جب انہیں کسی بڑے آدمی نے ڈنر دیا تھا۔ آپ مجبور ہو کر چپ ہو جائیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ان دونوں کے برادر کلاں ایک لیڈر ایسے دیکھے گئے جو تقریر کرنے میں اپنے جسم کے تمام حصوں کو نکال دیتے ہیں۔ کچھ حصے سے بستے ہیں کچھ سے چیختے ہیں۔ کچھ سے پھڑکتے ہیں۔ ان کی رگ رگ میں قوم کا درد ہے۔ جس کی مرہم پٹی قوم کے ایثار سے کرتے ہیں۔ لیڈری کا گر تو انھوں نے اپنے وطن میں سیکھا تھا البتہ اس کی تکمیل مدراس میں کی۔ انھوں نے قوم کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے تقسیم عمل کا اصول یہ رکھا تھا کہ خود چپ رہیں

اور کاسمیٹک قوم کی۔ اب ڈاڑھی اُگی ہوتی ہے خضاب قوم کا۔ قوم کو خطرہ میں پاتے ہیں تو چندہ وصول کر کے اپنے آپ کو خطرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں اس لئے کہ روپیہ پیسہ خطرہ کی چیز ہے جس کے پاس ہوگی وہ خطرہ میں ہوگا اور وہ لیڈر ہی کیا جو قوم کی خاطر اپنے آپ کو خطرہ میں نہ پھنسائے۔

ایک لیڈر اس کے قائل ہیں کہ لڑائی صرف میدان جنگ کے نقشے تصنیف کرنے سے جیتی جا سکتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ فتح و شکست نصیبوں سے نہیں منسوب کی ہوتی ہے اور ہار جیت کا مدار لڑائی کی عاقبت پر نہیں جنرل کی عافیت پر ہے۔ اپنی طاقت سے زیادہ دشمن کی کمزوری پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ان کے نزدیک سب سے قابل اعتماد سپاہی وہ ہیں جو جان دیں یا نہ دیں ووٹ دیں اور ایسے سپاہی اُسی وقت مہیا ہو سکتے ہیں جب ان میں جنگ کا ولولہ نہیں مال غنیمت کی تقسیم کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ لڑائی پہلے اپنے ہاں لڑی جاتی ہے اس کے بعد دشمن کا مقابلہ کرنے نکلتے ہیں۔ بزدلی، تنگ نظری، عافیت جوئی، جاہ طلبی، مشیخت اور خود غرضی پر قابو پانے سے پہلے دشمن کو دعوت جنگ دینا غلطی نہیں غداری ہے۔

گرم ممالک کے خصوصی امراض و ادویات پر تحقیقات کرنے کے لئے حکومت نے ادارہ اسٹیٹ اسٹیٹیوٹ کھول رکھے ہیں۔ ان اداروں کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ لیڈری کے مرض اور اس کے انسدادی تدابیر پر بھی غور کریں۔ یہ ہندوستا

خاص مرض ہے جس سے باشندوں کی عافیت خطرہ میں ہے اس مرض کا سدباب حکومت اور پبلک دونوں کی متفقہ کوشش سے ہو سکتا ہے۔ ٹڈی دَل کی طرح اس آفت کے انسداد کا اب تک کوئی مؤثر و معقول طریقہ کار نہیں دریافت ہو سکا۔ گورنمنٹ صرف یہ کر سکتی ہے کہ ہر خطرہ کے وقت سائرن بجایا جائے جس کے اسٹیشن جا بجا موجود ہوں گے جیسا کہ ہوائی جہازوں کے حملے سے بچنے کے لئے یورپ میں کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ہر باشندہ کو جھاڑو، راکھ اور مشعلیں لے کر جو حکومت کی طرف سے مفت تقسیم کی جائیں گی، نکل پڑنا چاہئے اور وہی سلوک ان سے کرنا چاہئے جو ٹڈیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے!

ابھی ابھی اسٹیشن آتے ہوئے حقہ کا ایک کش لینے کے لئے چار درویشوں کے کلب پہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ خدا ترسوں کی ایک کانفرنس منعقد ہے جہاں اس چیز پر بڑی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ کہ ادھر کئی سال سے امریکہ کے جتنے سیاح نوادر جمع کرنے ہندوستان آتے ہیں وہ بڑی بڑی رقمیں صرف کر کے لیڈروں کی کھیپ کی کھیپ امریکہ کے عجائب خانہ کے لئے بھیج رہی ہیں، جہاں ان کو دیکھنے کے لئے لوگ جوق جوق آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اب وہاں کے سرکس اور سنیما کمپنیوں کی طرف سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ جس پر کمپنی کے مالکوں نے انقلاب برپا کرنے کی دھمکی دی ہے۔ بالآخر طے یہ پایا ہے کہ عجائب خانہ کے منتظمین ان لیڈروں کو عاریتاً تماشہ کمپنیوں کو دیتے رہیں گے۔ ایک دوسرے ممبر نے جناب صدر کو چونکا کر جو آنکھیں بند کئے غالباً امریکہ کے زیر بحث عجائب خانہ کی سیر کر رہے تھے۔ بتایا کہ حکومت نے ابھی ابھی ایک سرکلر جاری کیا ہے کہ امریکن سیاحوں کے اس مشغلہ میں مداخلت کرنے سے بین الاقوامی پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ البتہ حکومت جاپان سے یہ تحریک کی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے کارخانوں سے ایسے لیڈروں کے کھلونے تیار کرا دے تو امریکہ والے انہیں کافی تعداد میں خرید لیا کریں گے اور جب تک ہندوستان اور امریکہ میں اس بارہ میں کوئی قابل عزت سمجھوتہ نہ ہو جائے حکومت امریکہ ان کھلونوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگائے گی۔ حکومت اس مسئلہ پر بھی غور کر رہی ہے کہ لیڈروں کے تحفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ کو اس قانون کے تحت کیوں نہ لایا جائے جو شکار کئے جانے والے جانوروں کے حق میں نافذ ہے!

کانفرنس شغل کے لئے ملتوی ہوئی تھی کہ میں بھاگا بھاگ ریڈیو اسٹیشن پہنچا محض یہ اطلاع کرنے کہ اس کانفرنس کی روئداد نشر کر دی ہو تو موقع غنیمت ہے

(مختار)

اگر عرصہ سے آپکے مضمون کی رسید یا خط کا جواب نہیں گیا تو اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ آپنے جوابی خط نہیں لکھا۔

منیجر
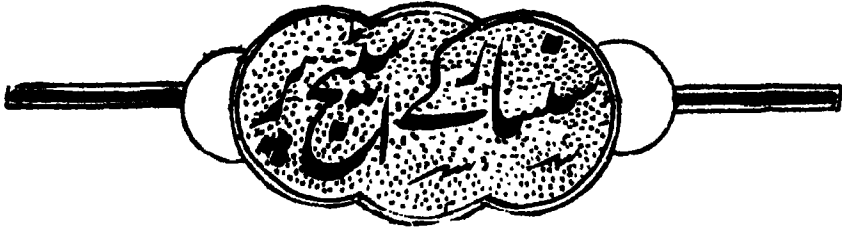
ازجناب مظفرالدین ملک صاحب حسنؔ کھیدوی (ڈرامیٹسٹ)

افراد

سدھارتھ ـــــ کپل وستو کے راجہ کا ولی عہد راجکمار جو بعد میں گوتم بدھ کہلایا

چھندک ـــــ راجکمار کا نوکر اور رتھ بان

سپاہی، بوڑھا، بیمار، جنازہ وغیرہ۔

(بالکونی شکل کا کھلا سا برآمدہ جس سے ملحق کمرے میں سدھارتھ سو رہا ہے، سامنے چنار کے درخت اور پہاڑ نظر آرہے ہیں۔ آسمان ابر آلود ہے ـــــ اور سدھارتھ عالمِ خواب میں اپنی پتنی گوپا کی خوشنما تصویر کو آہستہ آہستہ کمزور ہوتے ہوتے آخر ہڈیوں کا پنجر کی شکل میں دیکھتا ہے، وہ اس ڈراؤنے منظر کو دیکھ کر بیدار ہو جاتا ہے)۔

سدھارتھ، (خواب سے چونکتے ہوئے) میں نے کیا دیکھا
دنیا کی خوبصورتی کو اتنی گری ہوئی حالت میں۔ حسنِ زیبا کا
رنگین نقش ایسی قابلِ نفرت شکل میں۔ میں سویا تھا۔
خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ گوپا گھلتے گھلتے صرف ہڈیوں کا
پنجر بنکر رہ گئی۔ تو کیا جس پر میں دل اور جان سے فریفتہ
ہوں وہ دراصل ماڈہ اور چام کی مکروہ تصویر ہے۔ کیا
جس فضا میں مجھے تبسم کے پھول ہی کھلے ہوئے نظر
آتے تھے وہ اتنی شکستہ اور خیالی تعمیر ہے سے
جس کو میں سمجھا ہوں دن کیا اسکے پیچھے رات ہے
لطیف روح اس مختصر سے جسم کی چار دیواری میں گھبراتی ہے
زندگی روح بجلی کی طرح تمام حیوانوں کے جسم میں چھپنا چاہتی
ہے ـــــ (پکارتا ہے) چھندک! چھندک!!

چھندک، شریمان
سدھارتھ، رات کتنی باقی ہے
چھندک، بہت کم
سدھارتھ، جس طرح سوکشم شعلہ باہر نکلنے کے لئے

اپنی روشنی کو شیشے کے لطیف سوراخوں سے زبردستی خارج
کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے
اسی طرح میرا من بھی محل سے باہر جانے کے لئے مچل رہا ہے
مجھے شہر اور اس کے باغوں کی سیر کراؤ —— جاؤ
رتھ لے آؤ۔
(چھندک واپس چلا جاتا ہے ۔ اور سدھارتھ کسی خیال
میں پلنگ پر سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہے)
(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

منظر دوم

تمام بازار میں یہ منادی کرائی جاتی ہے کہ آج
پہلی مرتبہ یوراج شہر میں آئیں گے ۔ شہر کی
زینت بڑھائیں گے ۔ اس لئے ہر گلی کوچے
پہ سپاہی تعینات رہیں کہ کوئی دوکان یا
مکان آرائش سے خالی نہ رہ جائے ۔ کوئی
بڑھا یا بیمار یا کوئی جنازہ آج اس راستے
سے گذرنے پائے ۔ بلکہ یوراج کی آمد آمد
کی خوشی میں برابر باجہ بجتا رہے ۔ ہر طرف
مسرت و شادمانی کی لہر دوڑتی نظر آئے ۔
چونکہ شدھودن مہاراج سدھارتھ کا خیال کچھ
بتا چکے تھے کہ دل کچھ دنیا سے برگشتہ نظر آتا ہے
اس لئے شہر کے ان حصوں میں بھی یہ منادی
کرا دی گئی کہ جہاں تک شاہی راستوں کا تعلق ہے۔
کوئی بوڑھا یا بیمار یا جنازہ دکھائی نہ دے ۔
اور جس کے یہاں کوئی مر بھی جائے وہ آج آدھی
رات تک لاش کو گھر سے نہ اٹھائے ۔ کیونکہ
دیکھنے اور سننے پر تیاگ اور انوراگ کا بہت
کچھ دار و مدار ہے ۔ نظریں جو کچھ دیکھتی ہیں
دل ان کی تصویر اتار کر سوچنے کے لئے دماغ کے
حوالے کر دیتا ہے)

[سدھارتھ رتھ پر سوار داخل ہوتا ہے
(نظارہ بازار)]

سدھارتھ (خود بخود) اہا! راجدھانی سوارگ کو لجا رہی ہے
عجیب شوبھا دکھا رہی ہے ۔ کیا ہر روز لوگ اسی طرح دوکانوں
اور مکانوں کو سجاتے ہیں یا کسی خاص موقع پر ایسی آرائش
دکھاتے ہیں۔

چھندک: یہ تو صرف یوراج کی خوشی میں لوگوں نے دوکانوں
کو سجایا ہے، یہاں کا یہ دستور ہے کہ جب کبھی کوئی راجہ یا
مہاراجہ سیر کو آتے ہیں تو ایسا نمائشی انتظام کیا جاتا ہے
مسرت کی ندی ہر روز اس خوشی سے نہیں بہتی ۔ یہ لوگوں
کی مصنوعی خوشی ہے، ہر چند کہ ان کے دل دکھ اور مصیبت
میں گھرے ہوئے ہیں ۔

سدھارتھ: کیا یہ مسرت صرف میری خاطر تھوڑی دیر
کے لئے ان کے حصہ میں آئی ہے ۔ کیا وہ ہر روز اسی طرح
مسرت کی دیویوں سے ہمکنار نہیں ہوتے ۔ آخر
ع
سکھی یہ بھی نہیں ہیں تو سکھی ہے کون دنیا میں

تو کیا وہ اصل پر جاد کھوں کا نشانہ ہے ———— (اچانک ایک بوڑھے آدمی کو دیکھتے ہیں) (چونک کر) ایں یہ کیسا آدمی ہے لبے نور آنکھیں جھکی ہوئی کمر اور کانپتا ہوا ہاتھ جس میں اتنی طاقت نہیں کہ لاٹھی کو اچھی طرح زمین پر ٹکا سکے۔ ع

عجیب الخلق کیا ایسے بھی ہیں انسان دنیا میں ؟

چھندک: مہاراج ! یہ ایک بوڑھا آدمی ہے (قہقہہ)

سدھارتھ: (حیرت سے) بوڑھا ؟

چھندک: جی ہاں، ہماری طرح ہی انسان ہے۔ لیکن اب وقت کی چھلنی سے زندگی کا پانی بڑی تیزی سے چھن رہا ہے۔

سدھارتھ: یہ اسیطرح اسی شکل و صورت سے اس دنیا میں آیا ہے ؟

چھندک: نہیں گردش دوران نے اسکو کچھ کا کچھ بنایا ہے کبھی ہماری طرح جوان تھا۔ اسکے پاس بھی کبھی صورت شکل حوصلے اور جوانمردی کا سامان تھا۔

سدھارتھ: پر وہ اب کیا ہوا۔

چھندک: اسکی طبیعت کے جوش کو رنگین اور معطر کرنے کے بعد جوانی کا پھول مرجھا گیا۔ اب اس کی ضعیفی کا زمانہ آگیا، اس کے حسین اور نفیس جسم کی تازگی پژمردگی میں بدل گئی۔ بڑھاپے کی مجبوریوں سے طاقتور دل کمزور اور زندہ دل و دماغ افسردہ ہو گئے ؎

سحر سے گھبرا کے ضبط شبنم سے نکہت گل نکل رہی ہے
کدھر سے بہکنا رہو نکیو موج ہستی اچھل رہی ہے

سدھارتھ: تو نپتا کیوں ہو سکے بیتسل طرح کا نپتا کیوں ہو

چھندک: بوئی بولو تو سہی اے کیا ہو رہا ہے ——کیا زلزلہ ؟

چھندک: نہیں نہیں۔ جوانی کا وجود بڑھاپے کے حضور میں ذلیل ہو رہا ہے۔ اس کی روح اور اسکے جوش جوانی کی کائنات پر فنا کی افسردہ تاریکی چھا رہی ہے۔ اسکی زندگی ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے شعلے کی طرح نیستی کی پستی میں جا رہی ہے۔

سدھارتھ: کیا تم بھی ———— ہاں ہاں میں تمہیں سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم بھی ایک دن اسیطرح ہو جاؤ گے۔

چھندک: کیوں نہیں، میں آپ، اور دنیا کے تمام لوگ جو آج جوان ہیں، کل اسیطرح بوڑھے اور ضعیف ہو جائیں گے جو پھول آج بوٹوں پر اپنا جوبن دکھا رہے ہیں ایک نہ ایک دن ضرور مرجھائیں گے۔ آج جہاں عیش و نشاط اور تفریح کی گلکاری ہے۔ وہیں کل درد و کرب بے چینی اور بیقراری ہوگی ؎

ہیں آج بہاریں گلشن پر کل فصل خزاں آجائیگی
اس ساز مسرت پر اک دن خاموشی بھی چھا جائیگی

سدھارتھ: کیا پھر یہ کبھی جوان نہیں ہوگا ؟

چھندک: (مسکرا کر) کیا مرجھایا ہوا پھول کبھی شاداب ہوتا ہے ؟

سدھارتھ: مطلب یہ کہ میں اور میری پیاری گوپا سب کی جوانی کی خوشیاں معدوم ہو جائیں گی شباب کی نیندیں اس طرح راحت سے محروم ہو جائیں گی۔

چھندک: (بے پروا ہو کر) ضرور ؎

رستہ یہی ہے جس سے ہو سنسار جا رہا ہے وہ کون ہے جو کال کی زد سے بچا رہا

سدھارتھ ' پھر تو انسان کا جوانی اور اسکی امنگوں پر نازاں ہونا بیکار ہے۔

چھندک ' کیونکہ یہ چند روزہ بہار ہے ——— کیوں؟

[رتھ آگے چلتا ہے۔ سامنے سے ایک (بوڑھا) بیمار آدمی افتاں و خیزاں چلا آتا ہے۔ سپاہی اسکو مار پیٹ کر سامنے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔]

دوسری طرف

بیمار ' اُف جان جاتی ہے۔ درد سے روح تڑپ رہی ہے طبیعت مٹی کی طرح تپ رہی ہے۔

سپاہی ' ارے مردود آگے کہاں جاتا ہے۔

بیمار ' بھائی کہاں جاتا ہوں' شفاخانے کو جاتا ہوں' اور کہاں جاؤں۔

(اس کے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں' آہستہ آہستہ اس پہ بیہوشی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے)۔

سدھارتھ ' (خوفزدہ ہوکر) رتھ روک لو' چھندک یہ کون ہے؟ ؎

کیوں یہ روتا جان کھوتا ہے نحیف و زار ہے
یہ بھی کیا بوڑھا ہے جو کمزور اور لاچار ہے

چھندک ' (پریشان ہوکر) ؎

یہ نہیں بوڑھا مگر مجبور اور لاچار ہے
آدمی چاہے جسے آزار نے بیمار ہے

سدھارتھ ' بیمار کیا ہوتا ہے؟ (تعجب سے چھندک کا منہ تکتے ہوئے)۔

چھندک ' ہمارا اور تمہارا جسم پرزوں کی ایک مشین ہے۔ جہاں بد پرہیزی اور بد اعتدالی سے کسی پرزے میں کچھ فتور آجاتا ہے۔ تو وہ کام کرنے سے رہ جاتا ہے۔ کل بگڑ جاتی ہے۔ اسی طرح بیماری میں طبیعت کی خوشی کے تمام سامان ملالت کے بوجھ کے نیچے دفن ہوجاتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ جس طرح برف سے ڈھکے ہوئے درختوں کے درمیان پہاڑ کی سنسان جگہوں میں چشموں کا نظام نہیں ملتا۔ اسیطرح بیماری میں دل کو آرام نہیں ملتا۔

سدھارتھ ' تو کیا سب ہی بیمار ہوتے ہیں؟

چھندک ' دکھ' سکھ سب کے ساتھ لگا ہے۔ پھول کو سرد اور گرم ہواؤں' خزاں اور بہار کی فضاؤں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اسیطرح ہر ایک آدمی کو کبھی نہ کبھی بیمار ہونا پڑتا ہے۔

سدھارتھ ' تو کیا اسی شریر کی ہم اتنی نمایش کرتے ہیں اسی بیماریوں اور عارضوں کے گھر کی رات دن زیوروں اور پوشاکوں سے زیبائش کرتے ہیں۔ کیا اسی جسم کے لئے جو ذرا دیر میں بیکار ہوجاتا ہے؟ اس کے لئے ہم دوسروں کے گلے کاٹ کر تاج و تخت کی آرزو کرتے ہیں؟ کیا اسی جسم کو جس کی یہ اوقات ہے لیکن پھر بھی اسکو ہم پھولوں کی سیج پر سلاتے ہیں؟ کیا اسی جسم کے لئے داس اور داسیوں کی نیند حرام کرکے خود آنند پاتے ہیں ؎

کیا اسی کے واسطے پرجاؤں پر ظلم وستم کا دور جاری ہے؟
(آواز آتی ہے) ہر کا نام ست ہے۔ شری رام نام ست ہے۔
سپاہی (قدم زور سے زمین پر مار کر) کمبختوں نے خاک
انتظام کیا۔ اس رذیل کو بھی آج ہی مرنا تھا۔

"ہر کا نام ست ہے شری رام نام ست ہے
ست بولے سوگت ہے۔"

[آواز قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں
تک کہ چند آدمی جنازہ لاتے ہوئے
نظر آتے ہیں۔]

سدھارتھ، چھندک! ٹھیرو، دیکھو سنو یہ کیوں
ایسی آوازیں لگا رہے ہیں۔ کیا اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔
چھندک، جنازہ
سدھارتھ، جنازہ بھی کیا کوئی بیماری ہے۔
چھندک، نہیں حضور، یہ انسان کی زندگی کی آخری شاہانہ
سواری ہے۔
سدھارتھ، اس کے اندر کیا ہے؟
چھندک، انسان فنا کی صورت میں۔
سدھارتھ، سوتا ہے۔
چھندک، مرا ہے، ہمیشہ کی نیند سوتا ہے ؎

اک نغمۂ صد راز ہے یعنی شکستہ ساز ہے
اک محفلِ خاموش ہے اک گمشدہ آواز ہے

سدھارتھ، چھندک! یہ کیا راز ہے ---- ذرا اور
وضاحت سے سمجھاؤ۔ میرے اچھے چھندک بتاؤ، بھگوان
کیلئے بتاؤ کہ کیا راز ہے۔
چھندک، سنئے، جو بڈھا آدمی آپنے دیکھا تھا، جب اس
بیماری کی طرح اسکو کوئی مرض آکر دباتا ہے اور مرض و طبیعت کی
لڑائی میں مرض میدان جیت جاتا ہے تو بولتا شریر روپی
قید خانے کی کمزور دیواروں کو توڑ کر آزاد ہو جاتا ہے۔ جسم کو
طاقت گرمی یا حرکت دینے کے لئے سانس پھر نہیں آتا۔
آدمی کی وہ آوازیں جو دنیا کی رونق میں رنگین لرزش پیدا
کرتی ہیں۔ خاموش ہو جاتی ہیں۔ برابر کے لئے خاموش
ہو جاتی ہیں سدھارتھ!
سدھارتھ، (چونک کر آنکھیں پر نم سی ہیں) کیا پھر کبھی یہ دنیا
کے کاروبار کرنے کے لئے اس جلوہ گاہ کے نظارے کے لئے
آنکھیں نہیں کھولے گا ----
چھندک، نہیں کبھی نہیں ----!
سدھارتھ، کیا ہر شخص دنیا سے اسیطرح کوچ کر جاتا ہے۔
چھندک، ہاں جو کوئی پیدا ہوتا ہے۔ وہ ضرور ہی ایک نہ
ایک دن مرتا ہے۔
سدھارتھ، کیا اس جان سے زیادہ عزیز زندگی کا یہی
انجام ہے؟
چھندک، موت اور بڑھاپے کا سبھوں کو شکار ہونا ہے۔
اس خار دار منزل سے سب ہی کو گذرنا پڑتا ہے۔ قدرت کے
ایک اٹل قانون کے چکر میں پڑا ہوا پرانی آزادی سے کوئی
کام نہیں کر سکتا۔ سکھ کے ساتھ دکھ، جوانی کے ساتھ بڑھاپا
جنم کے ساتھ مرن، اور خزاں کے ساتھ بہار وابستہ ہے۔

یہ اصول فطرت ہے۔ سنسار قدرت یہی ہے۔ جیو ایک دانہ ہے جو نہ جانے کس کس انقلاب کی چکی میں پستا ہے، دکھوں کے بھنور میں پھنسا ہوا اُوتا اور چلاتا ہے۔ دعائیں مانگتا ہے اور گڑگڑاتا ہے۔ پلہ نہیں چھڑا سکتا۔ عزیز بیٹے کو موت کے پنجے میں دیکھ کر باپ کسی قیمت پر بھی اپنے دل کے ٹکڑے کو نہیں بچا سکتا۔ دنیا کی خوشرنگ شراب میں سینکڑوں ہلاک اور زہریلے جراثیم موجود ہیں۔

سدھارتھ: تو بڑھاپا کسی خاص شخص کے حصہ میں نہیں آیا کیوں ——— ؟ بلکہ کل دنیا کے ہر ایک جاندار کی جوانی کو غارت کر دینے کیلئے ہے۔ آہ! صحت کی حالت خواب کی طرح ناپائیدار ہے۔ بیماری کیسی ڈراؤنی صورت پیدا کر دیتی ہے کوئی دانا و بینا اس حالت کو سمجھ بوجھ کر عیش و خوشی ان تماشوں میں مشغول نہیں رہ سکتا۔

چھندک: لیکن مہاراج! سنسار کے اسٹیج پر تو یہی ہوتا ہے۔

سدھارتھ: لیکن ——— آہ! (خوف زدہ ہو کر اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے) فنا و بقا کا یہ راز کیونکر سمجھا جائے؟

[سدھارتھ دل پر ہاتھ رکھتا ہے غشی کی حالت میں نیچے گرتا ہے کہ چھندک پکڑ لیتا ہے۔]

پردہ

از جناب مسعود الرحمٰن صاحب اختر بختیار پوری

در حقیقت میں بہت ہی نیک واقع ہوا ہوں اور جتنا نیک میں اب وقت ہوں اس سے کہیں زیادہ بچپن میں تھا لیکن مجھ میں ایک عیب تھا اور وہ کچھ کچھ ابھی تک باقی ہے — یعنی یہ جب کوئی شخص میرے ساتھ بدسلوکی کرتا تو اس کا عوض میں اس سے ضرور لیتا۔ بغیر بدلہ وصول کئے میرے دل کو چین ہی نہیں آتا — اگر مجھے کوئی چپت مارتا تو میں فوراً ہی اس کا جواب گھونسہ سے دیدیتا — کمزوروں یعنی اپنے سے کمزوروں اور بچوں سے بدلہ تو بہ آسانی لے لیتا — اور اس سہل کام کو ہر شخص نہایت ہی خوش اسلوبی وخیر و خوبی سے انجام دے سکتا ہے — لیکن طاقتور اور جوانوں سے بھی بدلہ وصول کئے بغیر نہیں رہتا تھا خواہ وہ مالی یا جسمانی نقصان ہی ہو — ہمارے گاؤں کے شاہ قمر الہدیٰ صاحب مجھے بہت ستاتے تھے جب دیکھئے للّاو نے اب ننگے سر کیوں ہے جاؤ ٹوپی پہن۔ کبھی دیکھئے تو گھر سے پکارتے جا ایک پیسہ کا تمباکو لے آ یا کبھی دوپہر میں دیکھتے تو چلاتے جا گھر جا دھوپ میں کیا مارا مارا پھر رہا ہے وہ اسی پر بس نہیں کرتے تھے۔ جب مکتب میں پڑھنے کے وقت آتے تو خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ اعتراض ضرور جڑتے "جی ہاں اسکو سبق کیا یاد ہوگا۔ رات دن تو مارا مارا پھرتا ہے" کبھی ابا جان سے کہتے آپ اس کو روکتے ٹوکتے نہیں۔ وحشی بنا پھرتا رہتا ہے" غرض ان کی حرکتوں سے ناک میں دم آگیا تھا وہ فطرتاً لڑاکو اور ادھر کی بات ادھر کرنے میں بھی اپنی آپ مثال تھے حسب عادت ایک روز آپ بری طرح مجھ پر برس پڑے۔ میں بھی جل بھن کر غصہ سے کباب ہو گیا — لیکن میرے لئے ان کو کوئی جسمانی نقصان پہنچانا تو ممکن نہ تھا........

.... کیونکہ شیر اور بکری کا مقابلہ کیا۔ میں ان کی زیادتی سے اندر اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کہ اچانک سے مجھے ایک تدبیر سوجھی دوپہر [illegible] — تھا سیدھے یکہ اسٹینڈ کی جانب روانہ ہو گیا — وہاں جا کر ایک روپیہ کرایہ پر ایک ٹمٹم لے آیا اور شاہ جی موصوف کے در دولت پہ کھڑا کر دیا [illegible]

میں آکر قیلولہ کرنے لگ گیا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ٹم ٹم والے نے دروازہ کے قریب جاکر بلند آواز سے پکارا ستی پردہ اور دہ بھیجئے، حضور ذرا جلدی کیجئے۔۔۔۔ جلدی۔ تین بار کی پکار سے پیرائن بی بی اٹھکر دروازہ کے پاس آئیں اور کواڑ کے اوٹ سے دریافت کیا۔ تم کیا پکار رہے ہو کیسا پردہ مانگ رہے ہو؟

"جی بہوا، ایک روپیہ کرایہ ٹھیک کرکے ٹم ٹم لائے ہیں اور آپ کہتی ہیں۔ کیسا پردہ۔۔۔۔ ذرا جلدی سے پردہ بھیجئے۔ یکہ والے نے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔ اس بیچاری غریب کے سمجھ میں نہ آیا کہ حقیقت ماجرا کیا ہے وہ سیدھی شاہ صاحب کے خلوت خانہ میں چلی گئیں اور انہیں صورت واقعہ سے آگاہ کیا۔ اسوقت ہمارے شاہ صاحب تعویذ کے نقش بنانے میں ہمہ تن مشغول تھے ان کے خیال کے تسلسل میں جو رخنہ پڑا تو آگ بگولہ ہوکر اٹھے۔ اور ڈھکتے ہوئے۔ یکہ بان پر بوچھار شروع کر دی کیوں بے تو کیسا پردہ مانگ رہا ہے جاتا ہے یا نہیں؟۔۔۔۔ ورنہ ایسا طمانچہ دونگا کہ کھوپڑی سیدھی ہو جائیگی۔" ہمارے مولوی صاحب قبلہ کے بارعب چہرے کا اگر رات کے وقت شیطان بھی دیکھ پاتا تو مارے خوف و ہراس کے چیختا چلاتا اور شور و غل کرتا ہوا بھاگتا نظر آتا۔ اسکی بھی روح فنا ہونے لگتی۔ لیکن یکہ والا ان سے کس بات میں کم تھا بلکہ وہ ان سے زیادہ مضبوط اور قوی ہیکل تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ہاتھ میں گھوڑے والی چابک بھی تھی۔ پھر وہ ان کی ڈانٹ میں کیوں آنے لگا۔ وہ بھی فوراً ڈٹ کر اور سینہ تان کر بولا "اگر سواری چلنا ہے تو چلئے ہم پہنچا دیں اور نہیں تو میرا روپیا دھر دیجئے۔ ہم بہت سے سافروں کو چھوڑ کر آدھا گھنٹہ سے جھک چلا رہا ہوں اور اب بلا روپیا لئے ہوئے چل جائیں، باہ حضور آپ نے خوب کہا۔۔۔۔"

اسی طرح سے دونوں میں دیر تک حجت ہوتی رہی۔ آخر نوبت بہ اینجا رسید کہ شاہ جی نے نہ وقت دیکھا نہ موقع تاؤ میں ایسے آئے کہ یکہ والے کی گردن پکڑ کر ایک تھپڑ دے مارا اب یکہ والے کیلئے بھی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ جو کچھ اس سے گستاخیاں سرزد ہونا تھیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ یہ لپاڈگی دونوں طرف سے جاری ہوگئی۔ یہ حادثہ شاہ صاحب کی زوجہ محترمہ کیلئے ہوش ربا تھا۔ وہ سکتہ کے عالم میں کھڑی پردہ سے جھانک رہی تھیں۔۔۔ قصہ مختصر یہ کہ ایک مرتبہ اس موذی یکہ والے نے اتنے زوروں میں گردن دبائی کہ گھگھی بندھ گئی۔ یہ منظر پیرائن جی کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں چیخ اٹھیں "ابے لے اپنا روپیہ لے میں ابھی لاکر روپیہ دیتی ہوں۔ کیوں خواہ مخواہ پریشان و ذلیل کرتا ہے" یکہ والے نے گردن چھوڑی۔ شاہ جی کپڑے جھاڑ کر الگ کھڑے ہوئے۔ پیرائن بی بی نے پردہ سے روپیہ پھینکا۔ اور شاہ جی کو اندر بلایا۔ اور صرف اسی قدر بولیں "تمہارا غصہ کبھی تمہارے قابو میں نہیں رہا"

ادبیات

جذباتِ مبارک

ازحضرت مبارک عظیم آبادی

چمن تو چمن تھا بہارِ چمن سے — چلے آپ رونق چلی انجمن سے
نہیں ہو تمہیں ہو وہ قاتل تمہیں ہو — جو تلوار کا کام لے بانکپن سے
بچا برق سے جب نشیمن ہمارا — برسنے لگی آگ چرخِ کہن سے
گذاری ہیں عمریں انہیں ہمدموں میں — یہ گہرے مراسم ہیں رنج و محن سے
کلی رہ گئی ناشگفتہ ہماری — گلا رہ گیا یہ نسیمِ چمن سے
یہ ٹوٹے ہوئے سازِ دل کی صدا ہے — مزا دل لگانے کا ہے دل شکن سے
مرے دیدۂ دل کی چوری تو دیکھو — نہیں لے چلے یہ بھری انجمن سے

جو موج آگئی آگئے ہم مبارک
کہ اب دور رہتے ہیں بزمِ سخن سے

کلامِ عابد

ازجناب سید زین العابدین صاحب عابد نقوی ایم-اے مصنف شہر گیا

جب کبھی یاد آپ کی آئی — خوں رلانے [illegible]
تیرے وعدوں کا یہ اثر تو ہوا — تیرے بند [illegible]
میرا قصہ تو قصۂ غم تھا — تجھے کس [illegible]

بجھ گئی شمع زندگی میری
اُن کے چہرہ پہ روشنی آئی
آپکے حسن کی عنایت ہے
عاشقوں کو جو عاشقی آئی
ایک انکار پہ یہ مایوسی
تم کو عابدؔ نہ عاشقی آئی

نقوشِ بہزاد

از جناب بہزاد فاطمی نبیرہ حضرت شاد عظیم آبادی

رازِ الفت بنے افسانہ یہ منظور نہیں
حسن کو داغ لگے عشق کا دستور نہیں
آپکو جلوہ دکھانے میں تامل کیا ہے
عشق مجبور ہے گر حسن تو مجبور نہیں
سر فروشوں سے ہی بازارِ وفا کی رونق
دار کیا دار ہی جبتک کوئی منصور نہیں
کاش چندے رہے ہمدم دلِ شوریدہ مزاج
منزلِ راہِ محبت تو بہت دور نہیں
یہ تو آئینِ وفا ہی کہ رہوں مہر بلب
عشق پابندی ہی لیکن کبھی مجبور نہیں
وسعتِ ذوقِ نظر چاہیئے جلووں کیلئے
حسن پردوں میں بھی رہ کر کبھی مستور نہیں
کس طرح ہو دلِ آزارِ طلب کی سیری
نشترِ غم بھی بہ اندازۂ ناسور نہیں
ہی یہی عمر گراں مایہ کا حاصل بہزاد
نقشِ الفت کو مٹا دوں مجھے منظور نہیں

جس کا حبیب دور ہو

از جناب ضمیر عمادی مجیبی عظیم آبادی

ظاہر ہیں قطرہ ہائے خوں دیدۂ اشکبار میں
شاید بہار آگئی گلشنِ قلبِ زار میں
وہ ہی ہے سوزشِ جگر وہی ہے جوشِ اضطراب
مر کر بھی اف نہیں ملا چین مجھے مزار میں
آج مریضِ عشق کا شاید جہاں سے کوچ ہے
اشک بھرے ہوئے ہیں دیدۂ غمگسار میں

رات بسر کریں گے ہم جاگ کے ٹیلکے کرو میں
نیند کا ہے گذر محال دیدۂ انتظار میں

ہائے برا ہو عشق کا چھین لیا سکون قلب
پھرتا ہوں خاک چھانتا وادی و کوہسار میں

جسکے جگر میں داغ ہو جس کا حبیب دور ہو
اسکو خوشی سے کیا غرض کیسی خوشی بہار میں

روزن در سے بار بار آپکو دیکھتا تھا میں
نیند نہ آئی رات بھر دیدۂ انتظار میں

صحن چمن سے کیا غرض کنج قفس میں ڈھونڈھ لے
آئے میری تلاش میں کوئی اگر بہار میں

اٹھو ضمیر خستہ جاں ملک عدم کی راہ لو
کبتک تم اٹھاؤگے یار کے انتظار میں

"کشیدگی"

از جناب نسیم سوز نیو ہاؤس راول گیا

اب آرزو ہے میری مجھکو بھول جاؤ تم!

میری نگاہ کو نا کامیاب رہنے دو!
میرے خیال کو پر اضطراب رہنے دو!
نہ کھولو عہد وفا کی کتاب رہنے دو!

اب آرزو ہے میری مجھکو بھول جاؤ تم!

تھا شکوہ پہلے کبھی مجھکو کج ادائی کا
دل حزیں کو تھا غم جور آزمائی کا
گلہ تھا مجھکو مقدر کی نارسائی کا

اب آرزو ہے میری مجھکو بھول جاؤ تم!

رباب روح کو مصروف آہ رہنے دو
میری حیات کو یونہی تباہ رہنے دو
نہ ڈالو مجھ پہ کرم کی نگاہ رہنے دو

اب آرزو ہے میری مجھکو بھول جاؤ تم!

نہ اجتناب کرو ظلم سے جفاؤں سے
تمہیں قسم ہے مبرا رہو وفاؤں سے
نہ اب سکون کا پیغام دو اداؤں سے
اب آرزو ہے میری مجھکو بھول جاؤ تم!

مجھے "وفا" کی ہے اب آرزو نہیں باقی
نگاہِ رحم کی اب جستجو نہیں باقی
میرے خیال کی دنیا میں تو نہیں باقی
اب آرزو ہے میری مجھکو بھول جاؤ تم!

رباعیات

از جناب دردؔ کاکوروی

دنیا میں حقیقت کا پتا ہے ہی نہیں
ادراک حقیقت آشنا ہے ہی نہیں
فطرت اسکی ہے دردؔ برنے جو اسے
کہنے کو تو واللہ خدا ہے ہی نہیں

بیگانۂ عشق آرزو کیا جانے
یہ راز اسیر ما و تو کیا جانے
جو خشک کناروں کو بھی دریا سمجھے
وہ لذت بحر جستجو کیا جانے

فطرت داد شکستہ پائی بھی تو دے
گم گشتگیوں میں رہنمائی بھی تو دے
صورت کوئی عشق میں اماں کی بھی ملے
قدرت نے دیا ہے دل خدائی بھی تو دے

مراسلہ و مناظرہ :-

[illegible]
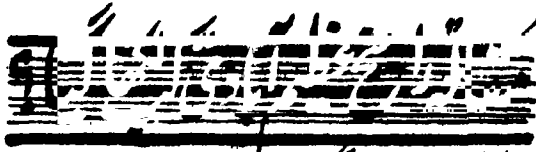
مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب مدعنایتکم

اسلام و نیاز

میرے مقالہ" راسخ عظیم آبادی" کے خلاف "ندیم" ماہ مئی ۱۹۳۹ء میں مناظرہ جناب سید اظہر الحق صاحب قادری میری نظر سے گزرا۔ قادری صاحب رقمطراز ہیں کہ میں نے قیس مرحوم کے مضمون سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔

یہ دونوں مقالے آج سے تقریباً پانچ چھ برس پہلے "ندیم" کے بہار نمبر میں شایع ہونے کے لئے بھیجے گئے جس وقت یہ مقالے لکھے گئے نہ قیس مرحوم کو یہ معلوم تھا کہ میں نے بھی اس مضمون پر خامہ فرسائی کی ہے نہ مجھے اس کا علم تھا کہ قیس مرحوم نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ جب ندیم کا بہار نمبر بابت ۱۹۳۲ء نکلا تو قیس مرحوم کا مقالہ میری نظر سے گزرا۔ میں یہ سمجھ کر خاموش ہو رہا کہ چونکہ مضمون ایک تھا اس لئے انجم صاحب نے دو میں سے ایک شائع کر دیا۔ اب آپ نے میرا وہ مقالہ جو دفتر میں پڑا تھا جنوری، فروری و مارچ کے ندیم میں شایع فرما دیا۔

ایک ایسے موضوع پر یعنی کسی کے سوانح عمری یا کسی کے کلام پر تنقید و تبصرہ کسی خاص شخص کا حصہ نہیں۔ کہیں کہیں یکسانی مضمون کے ساتھ ایسے بہتیرے مقالے ایک ہی شخص کے بارے میں نکل چکے ہیں۔ آپ خود میرا اور قیس مرحوم کا مقالہ بالمقابل رکھ کر ملاحظہ فرمائیں، اور آئندہ ندیم میں اپنی باصواب رائے سے اس قضیہ کا فیصلہ کریں۔

زیادہ نیاز

توحید عظیم آبادی

ندیم، مقالہ نگار کا بیان صحیح ہے، ان کا وہ زیر بحث مضمون ندیم بہار نمبر ۳۳ء کی اشاعت سے پہلے ۸ مئی ۳۲ء کو دفتر میں موصول ہو چکا تھا۔ مضمون کے پہلے صفحہ پر اس کی وصولی کی تاریخ یوں درج ہے "مضمون ع۲۱۶ ۸ 5/32"

ہمیں یہ مضمون پرانے مضامین میں کارآمد نظر آیا۔ اور بعض موقعوں پر قیس مرحوم کے مضمون کے مباحث پر اضافہ بھی نظر آیا اس لئے اس کو شائع کرنا مناسب سمجھا گیا۔

امید ہے کہ اس حقیقت کے اظہار کے بعد جناب اظہر الحق اور حضرت حمید کے شاگرد جناب طالب حمیدی اپنے شبہا دور فرمائیں گے۔ کیونکہ جو چیز پہلے چھپی نہ ہو اس سے استفادہ یا ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکر ممکن ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ان دونوں کے مضامین کا سرچشمہ کوئی ایک ہی ہو، اور ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر اسکو مرتب کیا ہو۔

مسلسل افسانہ۔ ٹارزن

یعنی

عجیب انسان

باب ۴۹

لیڈی الیس کے مسافر

از جناب محمد احسن صاحب بھلوی پوری

کلیٹن کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کے منہ میں صاف تازہ اور ٹھنڈا پانی گر رہا ہے اور وہ خواہش کے مطابق اُسے پی رہے ہیں۔ وہ چونک اُٹھے اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ آسمان میں بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پانی بہت زور شور سے برس رہا ہے اور ان کے سارے کپڑے بالکل بھینگ گئے ہیں۔ انھوں نے اپنا منہ کھول کر خوب پانی پیا۔ جسکی وجہ سے ان کے بدن میں نئی قوت آتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ کوشش کر کے ہاتھ کے سہارے وہ اُٹھ بیٹھے ان کے پاؤں کے پاس تھیورن پڑا ہوا تھا۔ اور کچھ دور پر کشتی کے پھندے میں اکڑی ہوئی جین پورٹر پڑی تھی۔ دیکھنے سے وہ بالکل مردہ معلوم ہوئی مشکل سے کھسک کر وہ اُس کے پاس گئے۔ اُس کا سر اُٹھا کر انھوں نے اپنی گود میں رکھا اور کچھ کپڑا تر کر کے اس کے خشک ہونٹوں کے اندر قطرہ قطرہ پانی ٹپکانے لگے انھوں نے سوچا کہ شاید ابھی جان باقی ہو اور وہ جی اُٹھے۔

تھوڑی دیر تو اس کے ہوش میں آنے کی کوئی اُمید نظر نہ آئی لیکن اس کے بعد بہت آہستہ سانس چلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اور اُنکی پلکیں کچھ ہلیں۔ کلیٹن نے تھوڑا پانی اور حلق میں ٹپکایا۔ ایک دفعہ کانپ کر جین پورٹر نے آنکھیں کھولدیں اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

رفتہ رفتہ پچھلی باتیں اُسے یاد آنے لگیں۔ اُس نے متعجب ہوکر پوچھا "کیا پانی مل گیا؟ کیا ہم بچ گئے؟"

کلیٹن نے جواب دیا "پانی برس رہا ہے اسی سے ہماری جان بچی ہے"

جین پورٹر نے کہا "اور مسٹر تھیورن کہاں ہیں؟ کیا انھوں نے تمہیں مار نہیں ڈالا؟ کیا وہ خود اپنی جان

ے ہاتھ دھو بیٹھے ہو"
کلیشن نے کہا "معلوم نہیں۔۔ دیکھوں تو پتہ لگے،
ر وہ اب تک زندہ ہیں۔ اور اس بارش نے پھر انھیں
وش میں لا دیا تو ۔۔۔" کہتے کہتے کلیشن دفعتاً چپ ہو گئے
نھوں نے سوچا کہ اس قسم کی باتیں کہہ کر اس بیچاری لڑکی
ی تکلیف میں اضافہ کرنا مناسب نہ ہو گا۔
جین پورٹر سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے اس
نے متردد لہجہ میں دریافت کیا "وہ ہیں کہاں؟"
کلیشن نے انگلی سے اس طرف اشارہ کیا
دھر تھیورن پڑا ہوا تھا۔ ایک لمحہ دونوں خاموش رہے
اس کے بعد آہستہ آواز میں جین بولی "نہیں،
ے ہوش میں نہ لاؤ۔ پانی پینے کے بعد جب اسے
اقت آ جائے گی تو وہ تمہاری جان کا گاہک ہو جائیگا
رنا ہے تو مرنے دو مجھے اس کشتی میں اس بدمعاش کے
ساتھ تنہا نہ چھوڑو"
کلیشن تھیورن کے پاس جاتے جاتے رک گئے،
ن کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہیئے۔ مناسب
یہ تھا کہ اسے دیکھا جاتا۔ اور اگر کچھ بھی زندگی کے آثار
س میں پائے جاتے تو پانی دیکر اسے ہوش میں لایا جاتا
یکن انھوں نے سوچا کہ ہوش میں آنے کے بعد ہو سکتا ہے
انھیں وہ پھر نقصان پہنچانے کی کوشش کرے اسی ادھیڑ
ن میں کلیشن نے تھیورن کی طرف سے نظر ہٹا کر اس
رف دیکھا جدھر کشتی کا پہلا حصہ تھا۔ ناگہاں وہ چونک

اٹھ کھڑے ہوئے اور مسرت آلود لہجہ میں کہنے لگے۔
"زمین، جین! خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ زمین کے
پاس پہنچ گئے"
جین پورٹر نے بھی اس طرف دیکھا جدھر کلیشن
دیکھ رہے تھے ان سے سو گز بھی کم فاصلہ پر زمین کا کنارہ
دکھائی دے رہا تھا اس کے بعد سرسبز و شاداب جنگل تھا
جین نے کہا "اب تم اسے اٹھا دو" اسے بھی تھیورن
کے متعلق اپنی باتوں سے کچھ تکلیف ہو رہی تھی وہ نہیں
چاہتی تھی کہ کسی کے مرنے کا الزام اس پر عائد ہو۔
تھیورن کو اٹھانے اور اسے پوری طرح سب
باتیں سمجھانے میں نصف گھنٹہ سے بھی زیادہ وقت
لگ گیا۔ اس اثنا میں بہتے ہوئے وہ لوگ ساحل کے
اور نزدیک آ گئے۔ اس وقت سمندر میں پانی بڑھ رہا تھا
کلیشن نے سوچا کہ پانی گھٹنے کے بعد ایسا نہ ہو کہ کشتی
کہیں دور بہہ جائے اور انھیں پھر پریشان ہونا پڑے
اس وجہ سے کشتی میں ایک رسی باندھ کر اور اس کا ایک
سرا ہاتھ سے پکڑ کر زمین پر اتر گئے۔ اور کچھ اوپر جا کر انھوں
نے اسے ایک درخت سے باندھ دیا۔ وہ سمجھ رہے تھے۔ کہ
جین پورٹر کو کئی گھنٹے کشتی ہی پر رہنا پڑے گا۔ کیونکہ ابھی
اتنی طاقت اس میں نہ آئی تھی کہ وہ اسے ہاتھوں پر
لے کر نیچے اتارتے۔
آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے۔ وہ ساحل پر چڑھ کر
جنگل میں چلے گئے اور وہاں کھانے کے لائق پھلوں

کی تلاش کرنے لگے۔ پہلے ہی کچھ روز وہ ٹارزن کے جنگل میں رہ چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کون پھل کھانے کے لائق ہے اور کون نہیں۔ ایک گھنٹے کے بعد پھلوں سے اپنی جھولی بھرے ہوئے وہ ساحل پر آئے۔

دھوپ بہت تیز ہوگئی تھی اسکی وجہ سے جین پورٹر بے چین ہو کر چاہ رہی تھی کہ کسی طرح کوشش کر کے کنارے پر چلنا چاہئے۔ کلیٹن کے لائے ہوئے پھلوں کے کھانے سے تینوں کے بدن میں کچھ اور طاقت آئی۔ بہت دیر میں کوشش کر کے وہ لوگ نیچے اترے اور اس درخت کے پاس پہنچے جس سے کشتی کی رسی کلیٹن نے باندھ دی تھی۔ اس تھوڑی سی محنت میں وہ لوگ اتنے تھک گئے تھے کہ وہیں زمین پر لیٹ رہے۔ لیٹتے ہی تکان کی وجہ سے انہیں فوراً نیند آگئی۔ شام تک سب گہری نیند میں پڑے رہے۔

ایک مہینہ کے قریب وہ لوگ سمندر کے اس ساحل پر رہے۔ کچھ قوت آنے کے بعد تھیورن اور کلیٹن دونوں نے مل کر ایک درخت کے اوپر کی شاخوں پر رہنے کے لئے ایک چھوٹی سی جگہ بنائی اور اس کے اوپر سایہ کا انتظام کر کے اور نیچے اترنے کا راستہ بنا کر اُسے ایسا بنا لیا کہ وہاں وہ لوگ ہوا پانی سے محفوظ رہ سکیں اور جنگل کے درندہ جانوروں سے انہیں کبھی کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ دن کے وقت وہ جنگل میں گھوم کر پھل جمع کرتے تھے یا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو پھنسانے کی کوشش کرتے تھے۔ رات کے پہلے ہی وہ اپنی جھونپڑی میں چڑھ جاتے تھے۔ وہاں ہر آدمی اپنی جگہ پر آرام کرتا تھا۔ ہمیشہ ساری رات ان کے نیچے خونی جانور غراتے اور گرجتے ہوئے گھوما کرتے تھے۔

وہ لوگ بستر کی بجائے جنگل کی خشک گھاس بچھاتے تھے۔ اوڑھنے کے لئے جین پورٹر کے پاس کلیٹن کی ایک چادر تھی جو کہ انہوں نے اُسے دے دیا تھا جھونپڑی کو کلیٹن نے بیچ میں آڑ کر کے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ نصف جگہ جین پورٹر کو دی گئی تھی اور نصف میں تھیورن اور وہ خود رہتے تھے۔

ساحل پر آنے کے بعد ہی سے تھیورن نے اپنی سب ذلیل عادات ظاہر کرنی شروع کر دی تھیں۔ جو اس کے بچپن ہی سے اُس کی چال چلن میں داخل ہو گئی تھیں اور جن کو مہذب لوگوں کے درمیان بڑی ہوشیاری سے اب تک چھپائے جا رہا تھا۔ خود غرضی، مکاری، بدمعاشی، بیہودگی اور خوف سب ہی باتیں اُس میں موجود تھیں۔ کوئی ایسی بری عادت نہ تھی جو اس میں نہ پائی جاتی ہو۔ جین پورٹر کی طرف اس کا خیال برا تھا۔ اس کے لئے اس میں اور کلیٹن میں دو بار مار پیٹ ہو چکی تھی اور اب کلیٹن یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو ایک منٹ کے لئے بھی تھیورن کے پاس تنہا چھوڑ کر کہیں جائیں ان دونوں کیلئے [illegible] بہت مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اس امید میں دن گذارتے جا رہے تھے کہ کبھی تو وہ اس جگہ سے چھٹکارا پائینگے۔

جین پورٹر کو کبھی کبھی وہ زمانہ یاد آجاتا تھا جب وہ یہاں کے جنگلوں میں ایک دوسرے مقام پر

ٹارزن کی کوٹھری میں رہتی تھی۔ کلیٹن سے تو اُسے کسی طرح کی مدد نہیں مل رہی ہے لیکن اگر ٹارزن اس وقت یہاں ہوتے تو اُسے نہ تو جنگلی جانوروں سے کوئی خوف ہوتا اور نہ کمینے تھیورن ہی سے دبنا پڑتا۔ وہ دونوں باتوں کا بہت آسانی سے انتظام کر لیتے۔ ایک دن جب کلیٹن پانی لانے چلے گئے تو تھیورن نے جین سے کوئی سخت بات کہی۔ اُس نے جواب میں کہا "اُسے تم اپنی قسمت کی خوبی سمجھو تھیورن کہ یہاں اس وقت مسٹر ٹارزن نہیں ہیں۔ بیچارے اُس جہاز سے سمندر میں گر گئے جو تمہیں اور مس اسٹرانگ کو کیپ ٹاؤن لے جا رہا تھا۔ اگر وہ ہوتے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تھیورن نے قطع کلام کر کے کہا "کیا تم اُس بدمعاش کو جانتی ہو"؟

جین پورٹر نے کہا "ہاں میں اُس سے واقف ہوں۔ میں نے بہت آدمی دنیا میں دیکھے لیکن سچا مرد اُسی کو پایا۔"

جین پورٹر کے انداز سے تھیورن سمجھ گیا کہ ٹارزن اور اُس میں معمولی دوستی نہ تھی بلکہ وہ اُنہیں کسی دوسری نگاہ سے بھی دیکھتی تھی۔ اس نے سوچا کہ ٹارزن تو سمندر میں ڈوب کر مر چکا ہے لیکن اُسے بدنام کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے۔ اس طرح سے اس کا بدلا اور پورا ہو جائے گا اور اُس کی باتیں سن کر لڑکی کو جو تکلیف ہوگی اس سے اُسے اور خوشی ہوگی۔ اُس نے کہا:۔

"وہ بدمعاش ہی نہیں گدھا اور بہت بے ایمان بھی تھا۔ اُس بزدل کو تو ہیجڑا ہونا چاہئے تھا۔ وہ فضول مرد ہوا۔ ایک بار ایک شریف عورت کی اُس نے آبروریزی کی۔ جب اُس کے شوہر نے اُس سے بدلا لینا چاہا تو اُس نے اپنا سارا قصور بیچاری عورت کے سر منڈھ دیا۔ اُس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس عورت کے خاوند نے میدان میں آنے کے لئے اُسے للکارا تو وہ فرانس چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ مس اسٹرانگ اور میں دونوں جس جہاز پر کیپ ٹاؤن جا رہے تھے، وہ بھی اُسی پر بھاگا جا رہا تھا، یہ باتیں میں اس وجہ سے جانتا ہوں کہ وہ عورت جس کا میں حال بیان کر رہا ہوں میری بہن ہے۔ اور ایک بات میں نے کسی سے نہیں کہی ہے لیکن تم سے کہتا ہوں۔ تمہارا بہادر ٹارزن جہاز سے کیوں پانی میں کود پڑا؟ جانتی ہو؟ میں نے اُسے جہاز پر پہچان لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میری بہن کے ساتھ تم نے جو برائی کی ہے اس کا بدلا میں تم سے لوں گا، تمہیں مجھ سے لڑنا ہوگا۔ بس یہ سنتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ مجھ سے لڑنے کی بہ نسبت اُس نے سمندر میں کود پڑنا اچھا سمجھا۔"

جین پورٹر نے زور سے ہنس کر کہا، "میں تمہیں اور مسٹر ٹارزن دونوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ کیا تمہیں یقین ہوتا ہے کہ میں تمہاری باتوں کو سچ مان لوں گی۔ اور تمہیں سچا سمجھوں گی!"

تھیورن نے پوچھا "تو ٹارزن کو نام بدل کر سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی"؟

جین پورٹر نے کرخت لہجہ میں جواب دیا "میں نہیں

کہہ سکتی کہ کیا ضرورت تھی۔ کوئی سبب ہوگا۔ تم جھوٹی
باتیں مجھ سے کہہ رہے ہو۔ تم جھوٹے ہو۔"

تھیوورن خاموش ہو رہا۔ جین پورٹر نے ڈانٹ کر
اُسے خاموش تو کرو دیا تھا لیکن اسکے دل میں شک نے گھر کر لیا تھا۔
اُسے یاد تھا کہ ہیزل سٹرانگ سے بھی ٹارزن نے اپنا نام جان کیلڈول بتایا تھا۔
جس جگہ یہ تینوں رہتے تھے اس سے پانچ میل
سے بھی کم فاصلہ پر شمال کی طرف ٹارزن کی وہ کوٹھڑی تھی
جس میں ایک بار پہلے جین پورٹر رہ چکی تھی۔ لیکن جین پورٹر
کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ جگہ اس سے اتنی نزدیک ہے۔
وہ اسے ہزاروں کوس دور سمجھتی تھی۔ وہاں سے تھوڑی
دور آگے تین چار میل کے بعد پھوس کے بنے ہوئے جھونپڑوں
میں اٹھارہ آدمیوں کی ایک اور چھوٹی جماعت رہتی تھی۔
یہ ان تین کشتیوں کے مسافر تھے جو کلیٹن کی کشتی سے
علیحدہ ہو گئی تھیں۔

ان تینوں کشتیوں کے آدمیوں کو جہاز کے
ڈوبنے کا بہت افسوس ہوا اور انہیں ناگہانی آفت کی وجہ
سے بہت پریشان ہونا پڑا لیکن انہیں ویسی تکالیف نہ اٹھانی
پڑیں جیسی چوتھی کشتی کے مسافروں کو اٹھانی پڑیں۔ نہ تو انہیں
کسی طوفان کا سامنا کرنا پڑا اور نہ کھانے پینے ہی کی کوئی
تکلیف ہوئی۔ تین دن مسلسل وہ ایک سمت میں ڈانڈ چلاتے
گئے اور چوتھے دن کی صبح کو زمین کے پاس پہنچ گئے۔ ان کا
خیال تھا کہ چوتھی کشتی ان سے علیحدہ ہو کر کسی جہاز کے پاس
گئی جہاں مسافر اس پر چڑھ گئے ہیں۔ وہ جلد باقی کشتیوں
کی تلاش کرائیں گے، سمندر کے سواحل پر ڈھونڈا جائیگا،
اور تب ان لوگوں کو بھی اس جنگلی زندگی سے نجات حاصل
ہوگی۔ جہاز پر جتنی گولی بارود اور بندوقیں تھیں سب لارڈ
رچرڈ کی کشتی پر رکھی گئی تھیں اس وجہ سے کنارہ پر پہنچنے کے
بعد ان لوگوں کو کھانے پینے کا اور آرام ہو گیا۔ وہ جانوروں کا
شکار کر سکتے تھے اور اسی کے ساتھ اپنی حفاظت بھی۔

ان لوگوں کو اگر کوئی فکر تھی تو صرف پروفیسر آرکیمیڈیس
کیو پورٹر کی۔ پروفیسر کو کسی طرح پورا یقین ہو گیا تھا کہ ان کی لڑکی
کسی جہاز پر اٹھالی گئی ہے اور اب وہ بالکل خطرہ کے باہر
ہے۔ اس یقین نے انہیں اس بات کی بالکل آزادی دے
دی تھی کہ وہ اعلیٰ علمی مسائل پر غور کرنا شروع کر دیں اور اُن
حل طلب مسائل کے حل کرنے میں لگ جائیں جو ان کا ہی سا
دماغ رکھنے والے انسانوں کے دماغ میں اُٹھا کرتے ہیں۔

ایک دن ان کے سکریٹری مسٹر سموئیل ٹی فلینڈر لارڈ
رچرڈ سے کہنے لگے "کیا کہوں، پروفیسر پورٹر کبھی ایسے نہ تھے
جیسے ان دنوں ہو رہے ہیں۔ نہ معلوم انہیں کیا ہو گیا ہے۔ آج
کی بات سنئے۔ ایک ضرورت سے تھوڑی دیر کیلئے میں ان سے
علیحدہ ہوا تھا۔ آکر دیکھتا ہوں کہ جہاں میں چھوڑ گیا تھا وہاں
سے وہ غائب ہیں۔ تھے کہاں! سمندر میں نصف میل
دور کشتی میں چڑھے ہوئے اُسے اپنی پوری قوت سے کھے
رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح کشتی پر چلے گئے
اور پھر کیسے اُسے اتنی دور کھے کر لے گئے! اس کی کشتی پر ایک
ہی ڈانڈ تھا، وہ اُسے چلا کر سیدھے نہیں چل رہے تھے بلکہ

فہرست مضامین

جلد ۱۱ - جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا جون سنہ ۱۹۳۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

Established 1931.

THE "NADEEM", GAYA.

A LEADING ALL INDIA ILLUSTRATED URDU MONTHLY JOURNAL

AND

THE BEST MEDIUM OF ADVERTISEMENT

EDITED BY

SYED REYASAT ALI, NADVI.

Nadeem is the literary and Educational journal of the province of Bihar which is published in Urdu. It is read generally in Northern India and particularly in Eastern India in the province of Behar, Orissa, and Bengal. This is the only journal whose voice reaches the Urdu reading public of Eastern India. **It has been approved by the Education Department of Behar** and is prescriebd for Schools & Colleges. The different local bodies of the province subscribe it for the Schools and Maktabs under them. Its subscribers are both Hindus & Muslims.

It is subscribed by the High Officials of the province including High Court Judges, Honab'le Ministers, Members of the Council and the Assembly, Civil servants, University and College Proffessors, as well as by the Rajas, Zamindars, Kisans, Traders, and Merchants all of whom look upon it with an eye of respect.

You can very easily send the voice of your firm to the upper classes of Eastern India through the Nadeem which is the **best advertising medium.**

Lastly it may be noted that it is difficult for you to find out any other medium through which you may send your voice to the Urdu reading public of Eastern India.

Advertisement Rates :—

	Full page (7½″ × [illegible])	Half page	¼ page
Yearly	72	40	25
Half yearly	40	25	15
Quarterly	25	15	8
Monthly	10	6	4

Special Rates.— For insertion of an advertisement in special issues of the NADEEM quotations will be supplied by the manager on application.

Discounts.— A discount will be given to the advertisers [illegible] to the [illegible] of the [illegible]

۲۷۵

رجسٹرڈ نمبر پی ۲۹۴ ماہ اگست ۱۹۳۹ء

صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

مرتبہ

سید ریاست علی ندوی

مطبوعہ ندیم پریس، کچہری روڈ، گیا

غسل کیلئے بے مثال صابون

دنیائے سائنس کی کامیاب تحقیق

کمینیا وھائٹ سوپ

اپنی خوشبو سے آپکے غسل کو فرحت بخشے گا تین عدد صابون کے پیکٹ کیلئے صرف ۱؎ علاوہ محصولڈاک ہر بڑے شہر کے اسٹور اور دوکان میں بکثرت ملتا۔ پوسٹیج کیلئے ۲؎ آنہ کا ٹکٹ روانہ کریں۔

دوسری قسمیں کمینیا صندل سوپ، دل بہار سوپ، کمینیا لونڈر سوپ اور مس وغیرہ تین عدد صابون کے پیکٹ کیلئے ۱؎ علاوہ محصول ڈاک

عمدہ اور سستے صابون کی دوسری قسمیں

کمینیا نرگش باتھ سوپ، کمینیا مورننگ سوپ، اگ سوپ، اور کمینیا بابا سوپ

کمینیا	نرگشی	باتھ	سوپ	قیمت فی درجن	۲/-
〃	مورننگ	〃	〃	〃 〃	عہر
〃	اگ	〃	〃	〃 〃	۱۴/-
〃	بابا	〃	〃	〃 〃	۱۲/-

بازار کے ہر اسٹور میں ملتا ہے۔ محصول ڈاک علاوہ۔ نمونہ سے معاف رکھیں البتہ نیچے کا کوپن دیکھ کر بھیجئے۔ نمونہ بھی مفت بھیجا جائے گا۔

سول ایجنٹس:۔ اینگلو انڈین ڈرگ اینڈ کیمیکل کمپنی بمبئی نمبر ۲

مفت عطیہ ... مہربانی کرکے اپنے بتائے ہوئے بالوں کے چار عدد نمونہ بھیج دیجئے۔ محصول کے لئے ۲ کے ٹکٹ روانہ کر رہا ہوں۔

ندیم کا بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء

آپ

مفت کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

ندیم کے بہار نمبر کی قیمت ڈیڑھ روپیہ یا اس سے زیادہ ہوگی۔ یہ آپ کو بلا قیمت بھی مل سکتا ہے بشرطیکہ سنہ ۳۹ء کے اندر آپ اپنا نام خریداری رجسٹر میں درج کرالیں اور زرِ چندہ وصول ہو جائے ندیم کے موجودہ خریداروں اور سنہ ۳۹ء میں خریدار ہو جانے والوں کو بہار نمبر سنہ ۴۰ء اسی زرِ چندہ سالانہ مبلغ للعہ میں دیا جائیگا۔ اگر آپ کی میز ندیم سے خالی رہتی ہے تو اس کمی کو پورا کریں ورنہ [illegible] ڈیڑھ دو روپے میں محض یہ ایک نمبر آپ کو خریدنا پڑیگا۔ سنہ ۴۰ء کے نئے خریداروں کے ساتھ یہ رعایت نہ ہوگی

یاد رکھیں!

کہ اگر آپ میں علمی و ادبی ذوق ہے تو ندیم کے بہار نمبر سنہ ۴۰ء کے مطالعہ سے آپ اپنے آپ کو نہ روک سکیں گے [illegible] ہے کہ آپ فوراً خریداری قبول فرمائیں۔ ماننا نہ ماننا آپ کا کام

مینیجر

مشتہرین کو مژدہ

رسالہ ندیم گیا کا بہار نمبر ۴۰ء ماہ جنوری ۴۰ء کے پہلے ہفتہ میں غیر معمولی اہتمام سے تیار ہو کر شائع ہوگا۔ ندیم کے بہار نمبر کی ہردلعزیزی کا شہرہ عام ہو چکا ہے۔ یہ نمبر ایک سال درمیان دیگر شائع ہوتا تھا۔ اس مرتبہ تین سال کے وقفہ سے شائع ہو رہا ہے۔ ندیم کے بہار نمبر کے مطالعہ سے خصوصاً صوبہ بہار کا کوئی پڑھا لکھا خالی نہیں رہ جاتا ہے ندیم کے بہار نمبر سے مشتہرین پورا فائدہ اوٹھا سکتے ہیں اور اس لئے اس کے ہر نمبر میں نرخ نامہ اشتہار اس کے عام نمبروں کے اشتہار سے جداگانہ رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ ہم مشتہرین کو دو ماہ کا موقع دیتے ہیں کہ جو مشتہرین ۳۰ ستمبر ۳۹ء تک دفتر میں رقم پیشگی بھیج دینگے ان سے عام نرخ کے بموجب اجرت لی جائے گی۔

۳۰ ستمبر گذر جانے کے بعد پھر یہ رعایت باقی نہیں رہیگی۔ بہار نمبر کا خاص نرخنامہ علیحدہ فارم پر چھاپا جا رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہوگا جو ۳۰ ستمبر کے بعد اپنی رقمیں بھیجیں گے۔

اگر آپ بہار نمبر میں اشتہار دیتے ہیں یا اب دینا چاہتے ہیں تو ندیم کے عام نرخ کے بموجب جو ندیم کے ٹائیٹل کے چوتھے صفحہ پر چھپا رہتا ہے۔ آپ اشتہار کی اجرت اور اشتہار کا مسودہ دفتر میں بھیجدیں

یہ طے شدہ فیصلہ ہے

کہ

۳۰ ستمبر گذرنے کے بعد بہار نمبر کا یہ رعایتی نرخ نامہ قائم نہیں رہیگا۔ پھر دفتر مجبور ہوگا کہ بہار نمبر کے خاص نرخنامہ سے آپ کے اشتہار لے۔

مناسب ہے کہ دیر نہ کریں۔ اور اپنی منظوری سے مطلع کر کے رقم پیشگی فوراً روانہ کریں۔ منیجر

ناظرین ندیم کو خوشخبری ہو

ندیم کا بہار نمبر سنہ ۱۹۴۶ء

ماہ جنوری سنہ ۴۶ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو جائیگا۔ اور وہ اپنے تمام پچھلے نمبروں سے ہر حیثیت سے بازی لے جائیگا

ندیم کے پچھلے بہار نمبروں میں التزام یہ تھا کہ اسکے سب مضمون نگار بہاری ہوں۔ لیکن بہار نمبر سنہ ۴۶ء میں یہ التزام لیا گیا ہے کہ مضمون نگاروں کیلئے صوبہ بہار سے شرف توطن رکھنا ضروری نہیں ہوگا' بلکہ یہ التزام کیا گیا ہے کہ

۱۔ مضمون نگار یا تو صوبہ بہار کے باشندے ہوں وہ جس موضوع پر چاہیں لکھیں۔

۲۔ یا کسی دوسرے صوبہ کے رہنے والے ہوں۔ لیکن ان کا مضمون صوبہ بہار ہی کے کسی پہلو پر لکھا گیا ہو۔

بہار نمبر سنہ ۴۶ء کے چند مضامین یہ ہیں

۱۔ دور حاضر میں صوبہ بہار کے مضمون نگار اور شعراء۔	سید ریاست علی ندوی۔
۲۔ صوبہ بہار کا مشہور گورنر، اودخاں ۔	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار
۳۔ قلعہ رہتاس گڑھ کے چند مناظر۔	سید عبد الرؤف صاحب ندوی اورنگ آباد

حسب ذیل ممتاز اکابر اس نمبر میں مضامین بھیجنے کا وعدہ فرما چکے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی ایم۔ اے۔ اسمٰعیل کالج بمبئی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم۔ اے۔ مسلم یونیورسٹی۔ پروفیسر سید مظفر الدین ندوی ایم۔ اے اسلامیہ کالج کلکتہ۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ جناب سید آفتاب حسن صاحب ایم۔ ایس۔ سی (حیدرآباد دکن) جناب صادق الخیری ایم۔ اے۔ پروفیسر دہلی یونیورسٹی۔ حضرت ماہر القادری وغیرہ۔

مضمون نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضامین روانہ کریں۔

بہار نمبر ۴۶ء

ندیم کے بہار نمبر ۴۶ء کے چند خصوصیات

۱۔ یہ نمبر صوبہ بہار کے ممتاز اہل قلم کے زور قلم کا آئینہ ہوگا

۲۔ ملک کے مختلف مشاہیر صوبہ بہار کی علمی و ادبی زندگی پر نظر ڈالیں گے۔

۳۔ بہار نمبر ۴۶ء کی زینت کلکتہ کے نوٹ پاتھ پر بکنے والی چھپی چھپائی پامال تصویروں سے نہ ہوگی۔ اسکی سہ رنگی تصویریں مصوری کا شاہکار ہونگی۔

۴۔ ممتاز اہل قلم اور شعرا کی تصویریں شائع کیجائینگی نئے مضمون نگار اور شعرا کی تصویریں بھی ہونگی۔ جو مستقبل میں اس صوبہ کے نامور ادیب ہونیوالے ہیں۔

۵۔ بہار نمبر ۴۶ء کے علمی مقالے معلومات میں اضافے کرنیوالی تنقیدیں ذہن میں جلا پیدا کرنیوالی افسانے زندگی کے عکس اور نظمیں و غزلیں جذبات کی ترجمانی کا آئینہ ہونگی [illegible] بہار نمبر ۴۶ء سے [illegible]

بہار نمبر کے مضمون نگاروں کو اطلاع

۱۔ بہار نمبر ۴۶ء کیلئے آپ کا مضمون ۱۵ر اکتوبر تک دفتر میں پہنچ جانا چاہیے۔

۲۔ مضامین اور افسانے حتی الامکان مختصر لکھیں۔

۳۔ مضمون کی رسید اگر چاہتے ہوں تو براہ کرم کارڈ یا ٹکٹ ضرور بھیجیں ورنہ جواب نہ دئے جانے کی شکایت معاف۔

۴۔ اگر آپ کی تصویر کا کوئی بلاک ہو تو اسکو بھیجیں۔ ورنہ نئی تصویر کھنچوا کر۔ تصویروں کی اشاعت و عدم اشاعت کے متعلق خط و کتابت سے مطلع کیا جائے گا۔ تصویریں بھی ۱۵ر اکتوبر تک دفتر میں آجانا چاہیں۔ تصویروں کے بلاک کلکتہ میں بنوائے جائینگے اور واپس بھی کی جائینگی۔

قیمت سالانہ للعہ — ششماہی ۳ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

رسالہ ندیم گیا

مرتبہ: سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۲ ماہ رجب المرجب ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۹ء | نمبر ۲

سید ریاست علی ندوی ایڈیٹر و مرتب نے [illegible] پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم [illegible] گیا سے شائع کیا

آہ! شاہ حسین الدین احمدؒ

آہ! کہ صدق و صفا، زہد و ورع، اخلاق و کرم و اخلاص و محبت کے مجسم پیکر حضرت سید شاہ حسین الدین احمد صاحب، منعمی ابو العلائی، سجادہ نشین خانقاہ منعمیہ ابو العلائیہ (گیا) نے اس دار فانی کو الوداع کہا۔ اور ۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۸ھ مطابق ۵ اگست ۳۹ء نو بجے دن کو حضرت مرحوم کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اور کالبد خاکی حضرت مرحوم کے پردادا حضرت حاجی سید شاہ عطا حسین فانی علیہ الرحمہ کے پہلو میں خانقاہ کے اندر ودیعت رکھا گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ندیم سے حضرت مرحوم کے تعلقات دیرینہ تھے۔ بلکہ ندیم کو مجھ سے، یا مجھے ندیم سے وابستہ ہو جانے کی تحریک کرنے والوں میں سے تھے۔ میں نے اس سلسلہ میں ابتداً مختلف دشواریاں ان کے سامنے معذرت کے طور پر پیش کی تھیں لیکن انھوں نے اس کے جواب میں ہر قسم کی آسانیاں مہیا کرنے اور فضل خداوندی سے مہیا ہو جانے کی توقعات دلائیں۔ بالآخر حضرت موصوف ہی کی پرحوصلہ امیدیں دلانے پر میں ندیم کو اپنے کمزور ہاتھوں میں لینے پر آمادہ ہوا۔ کچھ دنوں مجھے ابتداً عظیم گڑھ میں رہنا ضروری تھا۔ اس لئے ابتدائی انتظام یہی قرار پایا کہ ندیم کا دفتر خانقاہ میں رکھا جائے۔ چنانچہ میرے ہاتھوں سے پہلا پرچہ خانقاہ ہی کے پتہ سے شائع ہوا۔ اور میری عدم موجودگی میں حضرت مرحوم ہی ندیم کے شعبۂ اہتمام کے نگراں تھے۔ یہ سارے کام محض اس اخلاص و محبت کے سبب انجام پائے۔ جس سے میں انکی تاحیات مشرف رہا۔ افسوس معلوم نہ تھا کہ ندیم اپنے اس محسن اعظم کی سرپرستی سے اس قدر جلد ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گا۔

میرے گوناگوں تعلقات حضرت مرحوم کے ساتھ وابستہ تھے۔ میرے خسر ڈاکٹر سید اکرم امام صاحب مرحوم جو انکی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ان کے مسترشد تھے۔ میرے اور حضرت مرحوم کے تعلقات کی بنیاد اسی

روحانی رشتہ سے قائم ہوئی - اس کے علاوہ وہ میرے والد ماجد صاحب قبلہ مدظلہٗ کے سگے ماموں حضرت قاضی سید مظاہر امام (متعنا اللہ بطول بقائہٖ) کے داماد تھے۔ حضرت قاضی صاحب مدظلہٗ حضرت مرحوم کے پردادا حضرت سید شاہ عطا حسین علیہ الرحمہ (بانی خانقاہ گیا) کے مرید و خلیفہ اور پچھلی صحبتوں کے آخری لعل شب چراغ ہیں پھر نئی قرابت یہ تھی کہ حضرت قاضی صاحب مدظلہٗ میرے خسر جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے حقیقی برادر معظم ہیں - اس جدید تعلق سے راقم سطور اور حضرت مرحوم دونوں سگے چچازاد ہم زلف تھے ۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ میرے ان کے درمیان ان ساری قرابتوں کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ میں انہیں جناب ڈاکٹر سید اکرم امام صاحب مرحوم کا مقتدیٰ مانتا تھا۔ اور وہ بھی مجھے اپنے خطوں میں التزام سے "ذاکرہم کم اللہ تعالیٰ فی الدارین" کی دعا سے سرفراز فرماتے۔ اور کبھی کبھی تجدد پسند فقیہ" کو "چڑانے" کے لئے لکھتے۔ "ذاکرہم کم اللہ تعالیٰ بکرامۃ الاولیاء" اس کے ساتھ اپنی معصوم بچی اور کمسن بچہ عزیزی سید شاہ غلام مصطفےٰ سلمہ اللہ سے مجھے "خالو" کہلواتے تھے -

---

میرے ان کے مخلصانہ مراسم جس طور پر شروع ہوئے انکو انھوں نے اخیر عمر تک نباہا۔ وہ اپنے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں مجھ سے صلاح و مشورہ فرماتے، اپنی نجی تحریریں دکھاتے، لائق اشاعت مسودوں میں مشورے لیتے، خواہ کسی کتاب کے چھپنے میں اس سبب کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جاتی - لیکن جب تک اس کے متعلق کوئی صلاح و مشورہ نہ فرما لیتے، اسکو شائع نہ فرماتے۔ کبھی ایسا ہوا کہ انھوں نے سو سو صفحوں کے لکھے ہوئے رسالہ کی اشاعت کو محض میرے حقیر مشورہ کو قبول فرما کر روک دیا۔ اور اسکی اشاعت کا ارادہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

حضرت مرحوم تصوف کی گود میں پیدا ہوئے۔ پرورش پائی، خود فیض اٹھایا اور ایک انبوہ کثیر کو فیضیاب فرما کر حق کی راہ دکھائی۔ سالِ پیدائش ۱۳۱۲ھ ہے۔ ۱۳۳۶ھ میں اپنے والد ماجد حضرت سید شاہ نظام الدین صاحبؒ کے سجادہ فقر پر رونق افروز ہوئے۔ وقت کا بڑا حصہ عبادات و ریاضات میں گزرتا۔ شب کی تنہا نمازیں کمال محویت سے پڑھتے - طریقہ "پاس انفاس" پر دوامی عمل تھا - انھوں نے اپنی مختصر زندگی میں وہ کچھ کر دکھایا، جو دوسروں سے کم کرتے بن آیا۔ وہ صوفیہ کو کسی ایک حلقہ میں سمیٹ لینے کا خاص خیال رکھتے تھے ۔ تاکہ اس ذریعہ سے تصوف پر آئے دن ہونیوالے حملوں کو جو ان کے خیال میں صحیح نہ تھے روکا جاسکے - ان کے نقطۂ نظر سے جو اعتراضات بیجا ہوں ان کا رد کیا جائے تصوف کے علمی پہلوؤں کو روشن کیا جائے - اور ان کو نئی زبان اور طرز ادا میں ڈھالا جائے - انہی مقاصد کے تحت

انھوں نے انجمن حزب الفقراء کی بنیاد ڈالی تھی ۔ اور اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے ۔ نیز وہ دوسری مقامی تحریکوں میں بھی غیر معمولی ہر دلعزیزی کے ساتھ حصہ لیتے رہتے تھے ۔ خانقاہ کی مسجد ۔ مقبرہ اور اصل خانقاہ کی نئی عمارت کی تعمیر حضرت مرحوم ہی کے ہاتھوں سے انجام پائی ۔

حضرت مرحوم سلسلہ چشتیہ ظفریہ منعمیہ میں مرید اور بہت سے پر عظمت سلاسل کے فیضیاب شیخ تھے ۔ علم تصوف پر نظر رکھتے تھے ۔ مختلف سلاسل کے باہمی روابط اور ان کے درمیان راہ طریقت کے نازک فرق مراتب کے رمز شناس تھے ۔ وہ صوفیہ کے تذکروں اور تصوف کے مختلف سلاسل و خانوادہ کی تاریخ کے گویا زندہ دائرۃ المعارف تھے ۔ خصوصاً حضرت شاہ عطا حسین علیہ الرحمہ کی تصنیفات گویا انہیں بر زبان یاد تھیں ۔ وہ ان کی ایک ایک کتاب کو شایع کرنے کا قصد رکھتے تھے ۔ اسی غرض سے انھوں نے اس شہر میں ایک لیتھو پریس قائم کیا تھا ۔ یہ مطبع اس شہر میں اسوقت کھولا گیا تھا ، جب یہاں اردو کا کوئی دوسرا پریس موجود نہ تھا ۔ حضرت شاہ عطا حسین علیہ الرحمہ کی تقریباً چار سو صفحوں کی ضخیم کتاب کیفیۃ العارفین و نسبۃ العاشقین ، اسی مطبع میں چھاپ کر شائع کی ۔ وہ بقیہ کتابیں ندیم پریس میں چھپوانے کا قصد رکھتے تھے ۔ انسوس کہ یہ حسرت بھی ان کے ساتھ ان کے دل میں مدفون ہو گئی ۔

وہ خود بھی لکھنے پڑھنے کا اچھا خاصہ مذاق رکھتے تھے ۔ غالباً ان کا سب سے پہلا مضمون پھلواری کے رسالہ معارف میں چھپا ۔ پھر ان کے چند قابل قدر مضامین ہندوستان کے مشہور علمی رسالہ "معارف" اعظم گڑھ میں شایع ہوئے ۔ وقتاً فوقتاً ندیم کو بھی انھوں نے نوازا اور بعض دوسرے رسالوں میں بھی لکھتے رہے ۔ چند رسالے بھی ان کے قلم سے انکی یادگار ہیں ۔ مثلاً تذکرۂ تبریزی (حضرت خواجہ جلال الدین تبریزیؒ) تذکرۂ فانی (حضرت سید شاہ عطا حسین علیہ الرحمہ) پنڈوہ (کے چند آثار اور ان کی سرگذشت) صوبہ بہار میں ابوالعلائی فیضان (خانقاہ دانا پور کی سرگذشت) اور پاس انفاس (غیر مطبوعہ) وغیرہ ، وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے ۔ ان کے قلمی مسودوں میں کئی رسالے اور مضامین (مکمل و نامکمل) موجود ہوں گے ۔

وہ مشرباً چشتی قادری تھے ۔ مذہبی خیالات میں تعشف اور تشدد نہ تھا ۔ مجھ میں اور حضرت موصوف میں مذہبی خیالات سے متعلق مختلف مباحث و مسائل پر دیر تک گفتگو رہتی ۔ میرے ان کے نقطۂ نظر کا فرق

[illegible] تھا۔ مگر انھوں نے ہمیشہ خندہ جبینی سے ان موضوعوں پر گفتگو فرمائی۔ اور بارہا یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ اپنے معتقدات و خیالات میں جادۂ اعتدال پر ہیں۔

وہ فیاضی کے مجسمہ، حسن اخلاق کے فرشتہ، گفتگو میں بیباک اور صداقت و راستبازی میں کوہ وقار تھے۔ ان کا قلم حق کے اظہار سے کبھی باز نہ آیا۔ وہ اپنوں اور غیروں، بزرگوں اور دوستوں کی بدسلوکیوں اور جائز شکایتوں کو بھی اپنے روزنامچہ میں ضبط تحریر میں لے آنے سے نہ رکتے۔ وہ معصوم نہ تھے ان سے غلطیاں بھی ہوتیں۔ مگر جب خود اپنی غلطیاں ان کے علم میں آتیں تو ان کے قبول کرنے میں کبھی پس و پیش نہ فرماتے۔ ان کا چہرہ پر رعب و باوقار تھا۔ طبیعت میں نفاست و لطافت تھی اور خوش لباسی کا خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ جس مجلس میں بیٹھتے چھا جاتے۔ ان کے سامنے مخالفت کی جرأت دشوار تھی۔ جسے اختلاف ہوتا وہ خود ہی سمٹا سمٹایا، دم بخود، مجلس کے کسی گوشہ میں خاموش بیٹھا رہتا۔ کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ ان کے رعب و جلال کے آگے دم مار سکے۔ ع

درکشورِ نفقر کردشاہی

اواخر عمر میں اولاد نرینہ ہوئی۔ جس سے ان کے دل کی دیرینہ تمنا بر آئی۔ میں نے ان کی محبت، شفقت، گرویدگی، اور دل کی جو کشش اس خرد سال بچے کے ساتھ دیکھی، وہ بہت کم خوش نصیب بچوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آہ کہ آج وہ خرد سال معصوم "یتیم" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اس معصوم بچہ عزیزی سید شاہ غلام مصطفےٰ سلمہ اللہ کو بہت کم اپنی نگاہوں سے دور رکھتے تھے۔ وہ اپنی کم عمری کے باوجود سجادہ پر بیٹھا ہوا۔ ان کی تسبیح سے کھیلا کرتا۔ تسبیح کے دانے ان کی انگلیوں میں اور امام تسبیح اس معصوم کی انگلیوں میں رہتے۔ کبھی چشم تصور وہ نظارہ یاد دلاتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے میں مصروف ہیں اور حضرت حسین علیہ السلام آپ کے پایہ مبارک سے کھیل رہے ہیں۔

اسی والہانہ شفقت و محبت کا یہ اثر تھا کہ حضرت مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں عزیز موصوف [illegible] اس کی خرد سالی کے باوجود "لبس خرقہ" کی رسم ادا فرمائی [illegible] کی خلافت [illegible]

سے کرائی سادہ اپنے تجویز سلاسل کا تحریری مجاز و ماذون بنایا۔ اور آپ ایک سے زیادہ تحریری یادداشتوں میں بہ تصریح لبس خرقہ کا حوالہ دیکر اسکو اپنا جانشین نامزد فرمایا۔ افسوس کہ یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت مرحوم کا خیالی خدشہ واقعہ کی صورت اختیار کر لیگا اور اس ننھی منی سی معصوم جان کے دوش ناتواں پر جانشینی کا یہ بارِ گراں اسی کمسنی اور نابالغی کے حال میں آ جائیگا اور خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ گیا صوبہ بہار کی مختلف خانقاہوں جیسے پھلواری، فیاضیہ سملی (پٹنہ سٹی) خانقاہ مخدوم الملک "بہار" کی سنت کی پیروی کریگی۔ اور ان خانقاہوں کی طرح اس خانقاہ میں بھی ایک خورد سال نابالغ یتیم کے سر پر دستار سجادگی رکھی جائے گی۔ خداوندا! اب نو عمر بچہ کی عمر میں برکت دے، علم کی دولت سے مالا مال فرما، اور اسکو سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق بخش۔ اور حضرت مرحوم کے ارادتمندوں اور پسماندگان کو توفیق عطا فرما کہ وہ ان کے نقش قدم پر چل کر تیری رحمت و مغفرت کے مستحق ٹھہریں۔ اور اس دارِ فانی سے کوچ کر جانے والے کو اپنی محبت و رضا کی بہشت جاوداں میں مقام بلند عطا فرما۔

قطعہ تاریخ سانحۂ ارتحال حضرت سید شاہ حسین الدین احمدؒ

از جناب سید ابو محمد حسن امام صبا آروی رئیس گیا

شہ حسین الدین احمد صافی و ہم منعمی
سید و زاہد حلیم و متقی اہلِ قلم
ساعت نہ صبح شنبہ بستردہ تاریخ را
عیسوی سال وصالش از حق و نیم مدیح
+ ۴۰ + ۱۰۸

خانقاہ بو العلائی را از رونق فزود
با مروت با خدا و با وداد و با وجود
در جمادِ آخری تسلیم جاں با حق نمود
قرب جد و مرشد و مولائے خود حاصل نمود
۱۷۹۱

۱۹۳۹ء

سطور بالا پریس میں جا چکی تھیں کہ اب بعض دیگر امور کا تذکرہ بھی ناموزوں نظر نہیں آتا۔ خدا کے فضل و کرم سے کل ۲۳ اگست کو شبانہ یوم تک عدد سے وہ پیچیدگی بھی دور ہو گئی جو عزیزی شاہ غلام مصطفےٰ سلمہ اللہ کی جانشینی سے متعلق خلاف توقع طور پر محل پیدا ہو گئی تھی چنانچہ انیسا ... ڈی۔ او کے ... طرفین کا راضی نامہ داخل ہو گیا۔ اور دفعہ یہ ہوئی کی جو پابندیاں عزیز موصوف کے سوتیلے چچا جناب سید شاہ حسام الدین وغیرہ پر عائد کی گئی تھیں وہ ان کے رضامند ہو جانے کے بعد اٹھا لی گئیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اس بچہ کی جانشینی کے متعلق جو یادداشت لکھی تھی یہ عجیب اتفاق کہ اس میں راقم سطور کے نام کو شاہد کے طور پر ثبت فرمایا تھا۔ اسلئے انکی وفات کے بعد اس کی ذمہ داری مجھ پر غیر معمولی طور پر اخلاقاً عائد ہو گئی تھی۔ بحمد اللہ کہ یہ کام انجام پا گیا۔ یتیم و معصوم بچہ کے حقوق کی حفاظت کیلئے ہمارے شہر کے ممتاز اکابر جناب سید ابو محمد حسن امام صاحب آروی مدظلہ اور جناب آنریبل سید حسین امام جس غیر معمولی انہماک کے ساتھ سینہ سپر ہوئے وہ ہماری مدح و ستایش سے بالاتر ہے۔ انکے ساتھ میرے محترم دوست جناب خواجہ جلال الدین ... وکیل و دیگر بعض مخلصوں کی مخلصانہ مساعی و خدمات کا دلی شکریہ بیجا نہیں ہے۔ جناب شاہ حسام الدین صاحب بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ بالآخر بہ تراضی اسی فیصلہ پر آ گئے جو روز اول صلح و آشتی کے ساتھ ان کے سامنے رکھا گیا تھا۔

سب سے آخر میں ناظرین ندیم کی خدمت میں معذرت پیش ہے کہ ان مصروفیتوں کے سبب ندیم کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ اور ... اشاعت میں غیر معمولی تعویق عمل میں آئی لہٰذا ان سطروں میں آخر کے ایک دو پارسے ندیم کی روش کے خلاف محض مقامی حالات کے ماتحت ندیم میں جگہ پا گئے ہیں۔

از جناب ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر گورنمنٹ کالج ملتان

"یہ مختصر تحریر ارسال کر رہا ہوں اگر مناسب سمجھیں تو "ندیم" میں شائع کر دیں۔ اس تحریر کی شان نزول یہ ہے کہ پچھلے دنوں یہاں ملتان میں ڈاکٹر اقبال کی برسی کے موقعہ پر ایک جلسہ کی صورت میں "یوم اقبال" منایا گیا تھا۔ میں نے بھی ایک مختصر تقریر کی تھی اور اس بات کو واضح کیا تھا کہ اقبال کے دل و دماغ میں فلسفۂ خودی نے کیسے نشوونما پائی۔ تقریر کا یہی حصہ میں نے بغرض اشاعت قلم بند کر دیا ہے۔"

عنایت اللہ از ملتان

جیسا کہ آپ حضرات پر مخفی نہ ہو گا۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا خودی یعنی انسانی شخصیت کی مضبوطی اور استواری پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ اور اپنی ایک مستقل تصنیف یعنی مثنوی اسرار خودی کو اسی امر کی تفہیم و تشریح کیلئے وقف کر دیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خودی کی تعلیم کو اقبال کے فلسفہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہی تعلیم خودی اُن کے پیغام عمل کا سنگ بنیاد ہے۔ اور عہد حاضر میں جبکہ مشرق مغرب کے مقابلہ میں کئی ایک میدانوں میں ہزیمت اٹھا چکا ہے۔ اقبال نے خودی پر زور دیکر مشرق اور اہل مشرق کی وہ بیش بہا خدمت سر انجام دی ہے۔ جس سے نہ صرف موجودہ نسل بلکہ ہماری آئندہ نسلیں بھی ابد الآباد تک انکی احسان مند رہیں گی۔ فلسفۂ خودی کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کیمبرج کے مشہور پروفیسر نکلسن نے مثنوی اسرار خودی کو انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور دیگر اہل قلم نے بھی مرحوم کے کلام پر نظر غائر ڈالکر ان کی تعلیم کا تجزیہ کر کے تعلیم خودی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی صاحب قلم

نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ ڈاکٹر اقبال پر راز خودی کس طرح منکشف ہوئے اور اُن کے دل میں اپنا راز زمانہ کو خود شناسی اور خودداری کا پیغام دینے کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ مرحوم نے اس امر کو ایک دفعہ خود اپنی زبان فیض ترجمان سے واضح کیا تھا۔ چنانچہ اس موقعہ پر اس بات کو ان ہی کے الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

[illegible] جب ڈاکٹر اقبال مرحوم دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ [illegible] ہندوستانی طلبہ نے جو اس وقت لندن میں مقیم تھے ڈاکٹر موصوف کے اعزاز میں ایک ضیافت دی تھی اور وہاں ڈاکٹر صاحب کے احباب اور مداحوں کو مدعو کیا تھا۔ چنانچہ اس تقریب پر مختلف قوموں کے اشخاص اور ممالک کی ایک اچھی خاصی جماعت جمع ہو گئی تھی۔ پروفیسر نکلسن، مسٹر عبداللہ یوسف علی اور دیگر فضلاء نے اس موقعہ پر برجستہ تقریریں کیں اور اپنے اپنے انداز میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا۔ یہ خاکسار بھی اس موقعہ پر موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سب کے جواب میں جو تقریر فرمائی اس کے دوران میں انہوں نے کئی ایک امور کا تذکرہ کیا جن میں سے اس موقعہ پر حاضرین کے سامنے دو باتیں ان ہی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ اول یہ کہ انہوں نے اپنی بعض تصانیف میں فارسی زبان کیوں استعمال کی اور دوسرے یہ کہ انہیں فلسفۂ خودی کی تعلیم دینے کا خیال کیسے پیدا ہوا۔

فارسی زبان کے استعمال کے متعلق آپ نے فرمایا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میں اپنی آواز کو ہندوستان سے باہر خصوصاً اہل ایران تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر یہ خیال درست نہیں۔ اگرچہ میرا پیغام یعنی پیغام عمل تمام دنیا کے لئے ہے اور اہل ایران میرے دائرہ خطاب سے خارج نہیں مگر میرے کلام کے اول مخاطب ہندوستان ہی کے خواص تھے کیونکہ میں اپنا پیغام اول مرحلہ میں صرف خواص تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ پہلے خواص کا سمجھدار طبقہ میرے پیغام کو سنے اور اپنی ذہنی صلاحیت کی بنا پر اسے صحیح طور پر سمجھے اور اس کو اچھی طرح اخذ کرنے کے بعد عوام تک پہنچائے کیونکہ دنیا کی تاریخ میں اکثر یوں ہوا ہے کہ دقیق خیالات اور باریک نکات جب عوام پر بغیر کسی واسطہ کے ظاہر کئے گئے تو کسی نے ان کو سمجھا کسی نے نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کہنے والے کی بات اور اس کا مفہوم و مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے اس بات سے مسرت ہے کہ جہاں تک مجھے علم ہے میں اپنے مقصد کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا اور میرے مخاطبین نے میرے کلام کی روح تک پہنچنے میں ایسی ٹھوکر نہیں کھائی جس سے گوہر مقصود گم ہو جائے۔

ڈاکٹر اقبال کے دل و دماغ میں فلسفۂ خودی کی نشوونما کیسے ہوئی اس کے متعلق آپ نے فرمایا کہ جب میں بڑا ہوا اور میں نے دنیائے مختلف مذہبوں، فلسفہ کے مختلف اسکولوں اور تاریخ کے مختلف دوروں کا مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا

کہ بالعموم مشرق میں افراد اور اقوام کا میلان طبع سکون اور جمود یعنی بے حرکتی اور بے حسی کی طرف ہے۔ بلکہ بعض فرقوں نے کھلے طور پر فنا ذات یعنی اپنی ہستی کو مٹانے کی تعلیم دی ہے۔ میں نے فوراً بھانپ لیا کہ مشرقی اقوام کا موجودہ زوال اور انحطاط اور پستی بھی بہت حد تک اسی قسم کی تعلیم کا بدیہی نتیجہ ہے۔ مثلاً نروان کا مسئلہ جس کا شمار بودھ مت کے عقائد خصوصی میں سے ہوتا ہے اس کا ماحصل بھی یہی بیان کیا جاتا ہے کہ انسان کی نجات اسی امر میں ہے کہ فرد بشر اپنی خودی سے دست بردار ہو جائے اور اپنی انفرادی حیثیت کو کھو دے۔ اسی طرح ہندوستان کے بعض قدیم فلسفیانہ مذاہب کی یہ تعلیم ہے کہ اس عالم رنگ و بو کی دراصل کوئی حقیقت نہیں بلکہ یہ سب کچھ جو ہم دیکھتے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں یہ سب مایا یعنی دھوکا اور سراب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دنیا کی یہی حقیقت ہے تو ایسی صورت میں انسان کی تمام سعی اور کوشش بے سود ثابت ہوگی۔ اور اس کی تمام جدو جہد رائیگاں جائے گی اور اس زندگی میں انسان کیلئے سعی پیہم کے لئے کوئی محرک باقی نہ رہے گا۔

اسی طرح مسلمانوں کے ہاں اکثر صوفیوں نے ترک دنیا اور گوشہ گیری پر بہت زور دیا ہے۔ اور مشاغل دنیا سے کنارہ کشی ہی کو نیکی تصور کر رکھا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو دائرہ شریعت کے اندر سمجھتے ہیں توکل کا غلط مفہوم سمجھے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے توکل کو بیکاری اور جمود اور بے حرکتی کا ہم معنی قرار دے رکھا ہے۔ اور اس دنیا میں جو دراصل عالم اسباب ہے ذرائع اور وسائل کے استعمال کو توکل کے منافی سمجھ رکھا ہے۔ ہماری مشرقی شاعری بھی اسی قسم کے خیالات اور رجحانات کی آئینہ دار ہے اور یاس و قنوطیت اور حرمان نصیبی اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زندگی اور مسائل زندگی کے متعلق جن لوگوں کا یہ انداز ہے وہ زندہ و توانا رہنے کی کہاں تک صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب میں اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گیا اور میں نے وہاں کے حالات کا بذات خود مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ مغرب میں بھی انسان بہت حد تک محو حیرت ہے اور سوچ بچار کرنے والے لوگ اپنے تشکک کے سبب سے اندرونی طور پر افسردہ خاطر ہیں۔ اگرچہ فلسفیوں کی موشگافیاں جاری ہیں مگر عروس حقیقت کا چہرہ ابھی تک زیر نقاب ہے اور انسان کا دل سچائی اور حقیقت کے بالمشافہ نظارہ جمال سے ہنوز مطمئن اور دل شاد کام نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد سامنے دیکھیے اگر ایک طرف انسان نے نیچر کی بعض قوتوں کو تسخیر کر لیا ہے تو دوسری طرف سائنس اور علم کی ترقی کے بعض ایسے پہلو بھی ہیں جن سے انسان کے دل میں اپنی کہتری بیچارگی اور بے مائگی کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ مثلاً علم ہیئت (ASTRONOMY) جوں جوں ترقی کر رہا ہے انسان کا یہ احساس بڑھ رہا ہے۔ کہ وہ کائنات کے مقابلہ میں ایک ذرہ بے مقدار ہے۔ لہذا اس کی انفرادی سعی و کوشش بھی اسی نسبت سے بے حقیقت اور بے معنی ہے۔ اس کے بعد جماعت انسانی کے معاشری پہلو کو لیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ جب سے دیار مغرب میں اقتصادی انقلاب (INDUSTRIAL REVOLUTION)

سراج ہندی

ہندوستان کا ایک گمنام مشہور عالم جسنے عالم اسلامی میں نام پیدا کیا

از سید ریاست علی ندوی

جامع طولون میں درس تفسیر کی خدمت کا اعزاز

یوں تو قاضی سراج ہندی نے ورود مصر کے بعد ہی درس اور تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن سرکاری فرمان کے رو سے درس و تدریس کا منصب ان کے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد حاصل ہوا۔ جب کہ مصر کے مشہور جامع طولون کے شیخ السلاجی نے ۷۴۹ھ میں وفات پائی، تو حکومت مصر نے ان کی جانشینی کی خدمت بھی انہی کے سپرد کی، اور وہ جامع طولون میں تفسیر کا درس دینے لگے۔[1]

تلامذہ | یوں اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ممکن ہے کہ بکثرت اہل علم ان کے تلامذہ کی صف میں نکلیں گے لیکن جن لوگوں کے نام ان کے سوانح میں بطور تلامذہ ملتے ہیں ان میں شیخ سعد الدین زیاسونی اور قاضی القضاۃ شمس الدین محمد بن محمد بن ابو بکر معروف بہ طرابلسی متوفی ۷۹۹ھ کے نام خاص طور پر لئے جاتے ہیں۔[2] آخر الذکر کو قاضی سراج الدین نے اپنی نیابت قضاء بھی سپرد کی اور پھر ان کی وفات کے بعد یہ دو مرتبہ قاضی القضاۃ کے بلند منصب پر فائز ہوئے۔ صاحب جواہر المضیہ شیخ محی الدین ابو محمد عبدالقادر بن ابی الوفا متوفی ۷۷۵ھ نے قاضی سراج الدین کو اپنا رفیق و استاد لکھا ہے۔[3]

---

[1] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۵۵؛ [2] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۸۲ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۳۱۱ ترجمہ طرابلسی سنہ ۷۹۹ھ [3] ص ۱۰

خدمت افتاء قاضی سراج الدین اپنے منصب کے لحاظ سے مذہب حنفی کے لئے مصر میں سب سے بڑے مفتی بھی تھے ان کی افتاء کی خدمت کا سلسلہ اس عہدہ پر آنے سے پہلے سے جاری تھا اور آخر عمر تک قائم رہا۔[1]

تصنیف و تالیف نیز تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری تھا ان کی عبارت شگفتہ اور فصیح و بلیغ ہوتی تھی (الدرالکامنہ ج ۳ ص ۱۵۵) اگر ان کی کتابوں کو فن وار تقسیم کیا جائے تو وہ مختلف علوم تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اختلاف مذاہب، کلام، عقائد اور تصوف میں ہیں لیکن عمومی حیثیت سے ان کی بیشتر تصنیفات فقہ و اصول فقہ میں ہیں۔ اور زیادہ تر انھوں نے فقہ حنفی کی معیاری کتابوں کی شرحیں لکھی ہیں۔ ابتک ان کی جن کتابوں کا پتہ چل سکا۔ وہ مع ان کے مباحث کی تفصیل اور نسخوں کی کیفیت کے ذیل میں پیش ہیں۔ کہ در اصل یہی ان کی زندگی کی بہترین یادگار ہیں۔

تصنیفات

شرح البدیع المسمیٰ بہ کاشف معانی البدیع و بیان مشکلہ المنیع اس کا تذکرہ ابن حجر، ابن عماد، کفوی، سیوطی، ابن کمال پاشا، طاش کبری زادہ اور حاجی خلیفہ نے کیا ہے۔

امام بزدوی علی بن محمد حنفی متوفی ۴۸۲ھ کی مشہور کتاب اصول، اصول فقہ کی بنیادی کتابوں میں سمجھی جاتی ہے بہت سے اہل علم نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ اسی طرح علامہ مدی سیف الدین ابو الحسن علی بن ابو علی بن محمد شافعی متوفی ۶۳۱ھ کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام بھی مشہور تصنیف ہے اور مطبعہ معارف مصر سے ۱۳۳۲ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

ابن ساعاتی شیخ مظفر الدین احمد بن علی بغدادی حنفی صوفی ۶۹۴ھ نے اصول کی مذکورہ بالا دونوں کتابوں کو جمع کرکے بدیع النظام میں کتاب البزدوی والاحکام نامے ایک کتاب لکھی۔ شیخ سراج الدین ہندی نے کاشف معانی البدیع و بیان مشکلہ المنیع کے نام سے ابن ساعاتی کی اسی کتاب کی شرح چار جلدوں میں لکھی ہے جس میں اصول فقہ کے مسائل کے بیان کے علاوہ اس فن کے مسائل پر شوافع و احناف کے مختلف فیہ مسائل اور ان کے دلائل سے بھی مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب ان الفاظ سے شروع ہوئی ہے:۔

"الحمد للہ الذی مہد قواعد الفقہ"[2]

---

[1] طبقات الحنفیہ ابن کمال پاشا ترجمہ عمر بن اسحاق مملوکہ کتب خانہ امیریہ بھوپال والدرالکامنہ و شذرات الذہب بحوالہ مذکورہ بالا۔ [2] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۹۲ تذکرہ بدیع النظام۔

کتاب کی ایک جلد کا ایک نادر نسخہ

ابتک اس کتاب کی صرف تیسری جلد کا پتہ چل سکا ہے جو کتب خانہ خدیویہ مصر میں محفوظ ہے یہ کتاب کا نادر نسخہ ہے۔ اس کی کتابت مصنف کی زندگی ہی میں ۱۳ رجمادی الاولیٰ ۷۶۹ھ کو تمام ہوئی۔ کاتب کا نام ابوبکر بن عمر بن ابوبکر اصفہانی ہے کتب خانہ میں کتاب کا عمومی نمبر ۲۰۹ اور فن وار نمبر ۶۹ ہے[1]

شرح البدیع کتاب التقریر والتحبیر کے مآخذ میں

سراج الدین ہندی کی یہ تصنیف شرح البدیع، ابن امیر الحاج متوفی ۸۷۹ھ کی کتاب التقریر والتحبیر کے مآخذ میں سے ہے۔ کتاب التقریر والتحبیر، ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ کی کتاب التحریر کی شرح ہے جو ۱۳۱۶ھ میں بولاق مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ اسمیں شرح البدیع کے بکثرت حوالے آتے ہیں کہیں اسکی عبارت نقل کی گئی ہے کسی جگہ اس کے مصنف کی رایوں سے استدلال کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر ابن ہمام اور سراج ہندی کی رایوں میں اختلاف ہونے کی صورت میں سراج کے مسلک کی تردید یا تائید یا توضیح کی گئی ہے ذیل میں اس کے بعض مباحث کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے شرح بدیع کے مباحث کا ایک سرسری اندازہ ہو سکے گا۔

تعریف اصول فقہ

علم اصول فقہ کی تعریف علمائے اصول دو مختلف قسم کے الفاظ میں کرتے ہیں۔ سعد الدین اور ابن حاجب وغیرہ نے یہ تعریف کی ہے۔

العلم بالقواعد التی یتوصل بہا الیہ علی وجہ التحقیق | یعنی اصول فقہ نام ہے ایسے قواعد یا کلیہ کے علم کا جن کے ذریعہ سے علم فقہ کی طرف تحقیقی طور پر رسائی حاصل ہو۔

دوسری طرف ابن ہمام وغیرہ لفظ بالکل ترک کر کے ان الفاظ میں اصول فقہ کی تحریر کرتے ہیں۔

ادراک القواعد التی یتوصل بہا الی استنباط الفقہ | ایسے کلیات کا ادراک کرنا جن سے فقہ کے استنباط کا راستہ حاصل ہو۔

ان دونوں تعریفوں میں جو بنیادی فرق ہے، وہ اصولیین کے نزدیک لفظ "علم" و "ادراک" کا ہے ابن امیر الحاج نے یہ لکھا ہے کہ جو اہل علم اصول فقہ کی تعریف لفظ "علم" کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان میں سے سراج الدین ہندی وغیرہ نے موقع پر "علم" کی تشریح "اعتقاد جازم مطابق واقع" سے کی ہے اس کے بعد اس سے ابن ہمام کا مسلک [illegible] انہوں نے کہا ہے کہ یہ لوگ اس تعریف میں "جزم وظن" اور "مطابق واقعہ وغیر واقعہ" ہونے کی شرط ضروری قرار نہیں دیتے۔ بلکہ نفس "ادراک" کا وجود ہونا چاہیے خواہ وہ ظنی ہو یا قطعی، اور مطابق واقعہ ہو یا غیر مطابق واقعہ جیسے کہ علم کلام میں فرق معتزلہ [illegible]

---

[1] فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۲ ص ۲۵۶،

کا خلاصہ یہ ہے کہ امر کا مفہوم اسی تک محدود رہے گا۔ اس کے ضد پر حاوی نہو گا۔ وہ اس مسئلہ کی تفریع یں کہتے ہیں۔ کہ مثلاً خدا کے کلام میں طلب قیام و ترک قعود کی شامل صحیح نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ خدا کا کلام واحد ہوتا ہے۔ وہ امر ہوگا۔ یا نہی وعدہ ہوگا یا وعید اسکے جواب میں سراج الدین وغیرہ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ

"اس میں شک نہیں کہ اللہ کا وہ کلام اپنی ذات کے اعتبار سے تو واحد ہی رہے گا۔ لیکن اپنے متعلقات کے لحاظ سے متعدد سمجھا جائیگا۔ اور غیریت کے متعلق جو ہماری گفتگو ہے وہ اسی لحاظ سے ہے" ج اص ۱۲۷،۱۵۱)

اسی طرح شوافع واحناف کے مختلف فیہ اصول مسائل مفہوم مخالف اور اس کے جزئیات میں سراج الدین کی بعض اور تفصیلی بحثیں ہیں۔ دیکھو ج (ص ۱۳۶، ۱۵۷)

کبائر و صغائر کی تفصیل

اصول فقہ میں راوی و شاہد کی روایت و شہادت کے قبول کرنے نہ کرنے کے ذیل میں دیگر شرائط کے ساتھ ایک قید یہ بھی لگائی جاتی ہے کہ وہ نہ کبائر کا ارتکاب کرتا ہو۔ اور نہ وہ معاصی صغائر کی پرواہ لیتے پے در پے عمل سے اصرار کے ساتھ نہ کرتا ہو۔ ورنہ اس سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں التزام وعمد سے سرزد ہوتی ہوں جو عموماً متانت اور ثقاہت اور طبعی تہذیب و شائستگی کے منافی ہوں۔ اس سلسلہ میں کبائر اور ثقاہت کے منافی افعال کا ذکر آتا ہے صاحب تقریر نے اولاً وہ حدیثیں نقل کی ہیں جن میں شرک، قتل نفس اور قذف محصنہ وغیرہ سات جرائم گنائے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں حدیث کی مختلف کتابوں سے متفرق حدیثوں کو جمع کرنیکے بعد وہ شیخ سراج الدین کی شرح بدیع سے ایک اقتباس نقل کرتا ہے۔ جس میں اس مسئلہ کی مزید توضیح کی گئی ہے۔ لکھتا ہے۔

"کبائر میں اہل علم نے ذیل کی چیزیں بھی داخل کی ہیں جیسا کہ شیخ سراج الدین ہندی کی شرح بدیع میں مذکور ہے۔ قمار بازی فضول خرچی۔ سلف صالح (یعنی صحابہ و تابعین) کی شان میں بدگوئی (خصوصاً) صحابہ کی شان میں بدکلامی، اور مال و دولت اور دین میں فساد کر کے ملک میں فساد کی کوشش کرنا، حاکم کا حق سے پھیر کر فیصلہ کرنا، اور دو نمازوں کو بلا عذر ملانا"

اسی طرح اسلامی اخلاق و روحانی شائستگی کے منافی افعال میں شرح بدیع کے حوالہ سے ذیل کی چیزیں شمار کی گئی ہیں۔

"اور جو چیزیں بلند اخلاق (المروۃ) کے منافی ہیں ان میں اولاً وہ صغائر ہیں۔ جو طبیعت کی خست پر دلالت کرتے ہیں جیسے ایک لقمہ کا چرا لینا یا حدیث کی روایت پر اجرت لینا، جیسا کہ شرح بدیع میں مذکور ہے اور اس میں بعض چیزیں ایسی بھی داخل ہیں جنھیں اگرچہ اسلام نے مباح کیا ہے (مگر وہ دراصل بلند معیار اسلامی اخلاق کے منافی ہیں) جیسے بازار میں (کھلے راستوں پر راہ چلتے) کھانا راستہ میں پیشاب کرنا اور ایسے چھوٹے پیشوں کا اختیار کرنا جو سنجیدہ اصحاب کے شایان شان نہیں بشرطیکہ ان کا آبائی پیشہ نہو) (ج ۲ ص ۲۴۴، ۲۵۷) (باقی)

میخانۂ الہام پر ایک تنقیدی نظر

دنیائے ادب کا ایک دلچسپ منظر، کلام شاد کی ترمیم و اصلاح

از جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب بی اے ایم اے ڈپٹی مجسٹریٹ موتیہاری

(۵)

شعر۔ اے ازلی الوجود لے ابدی البقا — بے ادبانہ نہ چل حلقۂ عبدیت میں آ

(طاغوت / دانش)

اصلاح۔

"حلقۂ عبدیت"۔ اس ترکیب میں ایک حرف تقطیع سے گر جاتا ہے۔ شعر کی بحر ہے۔ مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن۔ لیکن حلقۂ عبدیت کی ت سے اس مصرع کی تقطیع یوں ہو جاتی ہے۔ مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن۔ صاف ظاہر ہے کہ لفظ عبدیت کی دال تقطیع سے گر جاتی ہے۔ مگر میرے خیال میں استاد مرحوم نے بالقصد اسکو جائز رکھا ہے اور عربی و فارسی شعرا کی تقلید کی ہے۔ ان کے دیوان کے بعض قلمی نسخوں میں یہ ٹکڑا یوں بدلا ہوا ہے "حلقۂ دانش" "حلقۂ طاغوت"۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصرع کے آخری رکن میں حرف کی زیادتی نا پسند ہوئی اس لئے مختلف اوقات میں عبدیت کی جگہ پر دانش اور طاغوت کے الفاظ بدلے گئے۔ لیکن آخر یہ دونوں الفاظ قلم زد کئے گئے اور وہی قدیم لفظ عبدیت اپنی جگہ پر آگیا۔

شعر۔ گستاخ تھا پہونچ گیا پروانہ شمع تک — میں بدنصیب تھا مجھے مانع ادب رہا

اصلاح۔ " " " — مجھ بدنصیب ہی کو خیال ادب رہا

" " " — یاں تا بہ حشر جان کا دشمن ادب رہا

شعر کے دوسرے مصرع میں کوئی خرابی نہ تھی بلکہ ترمیم شدہ مصرعے اس کے مقابلہ میں کمزور نظر آتے ہیں یہ شعر میخانۂ الہام سے خارج ہے۔

شعر: گڑے ہوئے گلوں کی شکل آنکھوں میں پھر گئی — اور بھی دل تڑپ گیا اب کی بہار دیکھ کر

اصلاح: " " صاف نظر میں " — " " " " " "

کیا خوب اصلاح ہوئی ہے تعریف نہیں ہو سکتی۔ "صاف نظر میں پھر گئی" اس سے مصرع میں صفائی پیدا ہوگئی۔ رنگ کے لفظ نے شعر کو چمکا دیا۔

شعر: رنج و الم میں کون تھا ساتھ بلا نصیب کا — چھوڑ دیا امید نے دل کو فگار دیکھ کر

اصلاح: وقت پڑا جو آ پڑا لے مری جان نامراد امید — تو بھی الگ تھا اگے ہی دل کو فگار دیکھ کر

میں نہیں سمجھتا کہ اصلاح سے شعر میں کیا ترقی ہوئی۔ پہلی صورت میں شعر اچھا خاصا تھا۔

شعر: تنگ نہ کر خدا کو باز لے مری دلگرفتگی — جائینگے ہم قفس میں خود نئی بہار دیکھ کر

اصلاح: " " " " " — جاؤنگا میں " "

شعر: ہر ایک ذرہ ہو شاہد مری تباہی کا — جہاں کی خاک کریں وہیں لہو نکلے

اصلاح: " " " " — " " " کریدوں " "

شعر:
ہے دل میں تڑپنے کی ہوس پر ضعف نے مشکیں کس دی ہیں
ہو بند اور آتش پر ہو چڑھا سیماب بھی وہ سیماب ہیں ہم

اصلاح:
اے ضعف تڑپنے کی ہوس تو نے مری مشکیں کس دی ہیں
ہو بند اور آتش پہ ہو چڑھا سیماب بھی وہ سیماب ہیں ہم

بالا تینوں اشعار میں شتر گربہ کا عیب پایا جاتا ہے۔ پہلے دونوں شعر میں اصلاح سے یہ عیب دور کیا گیا ہے لیکن مجھے شبہہ ہے یہ اصلاح خود استاد مرحوم کی ہے۔ حمید صاحب نے ان شعروں کو ترمیم شدہ صورت میں درج تو کیا اگر تیسرے شعر پر اُن کی نگاہ نہ گئی کہ اس میں تو اصلاح کے بعد شتر گربہ کا عیب پیدا ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگ صوبہ بہار میں شتر گربہ کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ ہم عام طور پر ایک ہی جملہ میں "میرا" اور "ہم" استعمال کرتے ہیں۔ حضرت شاد مرحوم بھی اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے دونوں شعروں کی اصلاح کو مشکوک کہتا ہوں۔

شعر: ہم سے اگر ہوا نہ ضبط ہم نے کیا جو کچھ کیا — ہم پہ اگر نہ تھا وثوق ہم سے بیان راز کیوں

اصلاح: ہم سے اگر ہوا نہ ضبط خیر یہ چوک ہو گئی — " " " " " " "

سبحان اللہ کیا پاکیزہ اصلاح ہے خیر یہ چوک ہو گئی۔ اس ٹکڑے کا کیا کہنا۔

شعر۔ کسی حالت نہ ہم سے بڑھ سکے گی رات فرقت کی — کہ ہم بازی سیہ بختی میں بھی اس شب سے جیتے ہیں

اصلاح۔ شبِ فرقت کی تاریکی نظر میں کب سماتی ہے — " " " "

ترمیم شدہ مصرع میں جو روانی و صفائی ہے محتاج بیان نہیں۔

شعر۔ کبھی مضطر کبھی محزوں کبھی وحشی کبھی بیخود — تعجب ہے کہ ہم ایسے دل سے کیونکر کام لیتے ہیں

اصلاح۔ برا ہو یا بھلا اسکو نہ پوچھو پھر دل اپنا ہے — اسی ناکام سے ہم سب طرح کے کام لیتے ہیں

اس شعر کی اصلاح بھی یقیناً قابل داد ہے۔ زبان کا لطف دوبالا ہوگیا اور مضمون کی خوبی میں بھی اضافہ ہوگیا۔

شعر۔ جہاں میں ہر جگہ مسکن مرا ہے وہ کہیں ہوں میں! — عجب اس گو مگو کی جا ہے ہوں اور پھر نہیں ہوں میں

اصلاح۔ " " " " — یہ ہونا بھی کوئی ہونا ہے ہوں اور پھر نہیں ہوں میں

ترمیم نے شعر کو بلند کر دیا۔ لیکن ایک مطلع اور بھی ہے جو کلام شاؔد مطبوعۂ جامعہ ملیہ میں یوں درج ہے ؎

نہ زیر آسماں ہوں میں نہ بالائے زمیں ہوں میں — یہ ہونا بھی کوئی ہونے میں ہونا ہے نہیں ہوں میں

شعر۔ تکیہ وعدہ پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں تہ خاک — حشر کا دن جو نہ آیا تو قیامت سمجھو

اصلاح۔ وعدۂ حشر پہ تکیہ کئے سب سوئے ہیں — " " " "

میرے خیال میں قدیم مصرع اصلاح شدہ مصرع سے کہیں بہتر تھا۔ اس میں ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے۔ دوسرے مصرع میں حشر کا لفظ موجود ہے۔ پہلے مصرع میں یہ لفظ لانے سے شعر بے مزہ ہوگیا۔ انداز بیان کے لحاظ سے بھی پہلا شعر بہتر ہے۔

شعر۔ شرم رکھ لے اے خدا میری شہادت گاہ میں — دست و بازو بے طرح قاتل کے تھرانے لگے

اصلاح۔ شرم میری سخت جانی کی ہے یا رب تیرے ہاتھ — " " " "

کیا مزے کا شعر ہے۔ اصلاح میں سخت جانی کا لفظ لایا گیا ہے جس سے شعر کی معنوی خوبیوں میں اضافہ ہوگیا۔ بلند پایہ اصلاح ہے۔

شعر۔ نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں نہ لب پہ ساقی فغاں رہیگی — یہی جو ساماں ہیں یہ نہوں گے تو پھر محبت کہاں رہیگی

اصلاح۔ بدن میں جبتک کہ دل ہے سالم تری محبت نہاں رہیگی — یہی تو مرکز ہے یہ نہو گا تو پھر محبت کہاں رہیگی

ساقی کا لفظ یہاں پر بے محل تھا۔ اصلاح شدہ شعر کا دوسرا مصرع اچھا ہے۔ لیکن مصرع اول میں محبت کی تکرار بے مزہ ہے۔ ان دونوں شعروں سے بہتر یہ شعر ہے جسے میخانۂ الہام میں جگہ نہ مل سکی ؎

بدن میں جبتک ہے روح باقی تری محبت نہاں رہیگی — لگی کو کیونکر بجھاؤں گا میں یہ آگ تا استخواں رہے گی

شعر۔ جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے جو سنے اسے بھی خلش رہے
ترے دونوں گیسوؤں کا بیاں مری زندگی سے دراز ہے

اصلاح۔ جو سنے اسے بھی خلش رہے جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے
یہ فسانہ زلفِ دراز کا کہیں زندگی سے دراز ہے

مصرع اول کی ترمیم کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ مصرع ثانی کی ترمیم نے شعر کو بہت پر لطف کر دیا۔ اتنا بے ساختہ اور پرکیف مصرع ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

شعر۔ وہ میری قبر پہ جب بے نقاب آنے لگے　　چراغ جتنے لحد پر تھے جھلملانے لگے

اصلاح۔ 〃 〃 〃 〃　　چراغ جتنے تھے روشن وہ جھلملانے لگے

قبر اور لحد کی تکرار بے ضرورت تھی۔ لحد کا لفظ نکل جانے اور اس کی جگہ پر روشن کا لفظ رکھنے سے سارا شعر چمک اٹھا خوب

اصلاح ہے۔

شعر۔ خالی سمجھ کے پھینک نہ اے موجِ رائگاں　　ہر کیسۂ حباب کے اندر خزانہ ہے

اصلاح۔ 〃 〃 〃　　ہر کیسۂ حباب میں بند اک خزانہ ہے

مصرع ثانی قدیم صورت میں کہیں بہتر تھا۔ اصلاح سے مصرع کی روانی میں فرق آگیا۔

شعر۔ یہ دلچسپی جئے جب تک جئے جینا اسی کا ہے　　پئے جو سیر ہو کر رات دن پینا اسی کا ہے

اصلاح۔ رہے ہر حال میں جو مطمئن جینا اسی کا ہے　　پلائے جس کو خود پیرِ مغاں پینا اسی کا ہے

ترمیم نے شعر کو چار چاند لگا دئے۔ اب یہ شعر کتنا بلند پایہ ہو گیا۔ سبحان اللہ۔

شعر۔ عبث اے شاد ابنائے زماں کی وضع کا شکوہ　　جوانوں کی طبیعت کچھ نہ کچھ رنگین ہوتی ہے

اصلاح۔ بجا کہتے ہیں گر تجھ پیر کو اے شاد کیا شکوہ　　〃 〃 〃 〃

قدیم مصرع میں جو کیفیت اور معنویت ہے اصلاح شدہ شعر کو نصیب نہیں۔

شعر۔ وہ چشم مست وہ ترچھی سناں خدا کی پناہ　　ٹھہر ٹھہر کے وہ انگڑائیاں خدا کی پناہ

اصلاح۔ وہ اسکی جھوم کے انگڑائیاں خدا کی پناہ　　وہ چشم مست وہ ترچھی سناں خدا کی پناہ

عجب پرکیف مطلع ہے۔ اصلاح نے اسکو اور ستانہ بنا دیا۔

الجھنا ہم سے تو قاصد کو ہم نے کیا اے دل　　سکھا دیا تھا کہ جانا تو جا کے رہ جانا

علم طب اور مسلمان

از جناب نبی احمد صاحب صلاحی سرائے میر، اعظم گڈھ

(۳)

یورپ کے ابتدائی معلمین

بارھویں صدی تک یورپ پر انتہائی جہل و ضلالت کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ ان کی طبی معلومات محض چند ناقص تجربوں اور اساطیری اوہام و خرافات کا مجموعہ تھیں شروع شروع میں جب یورپ میں اصولی طب کی تحصیل کا احساس پیدا ہوا تو یہ غرض محض مسلمان اطبا کی تصانیف کا ترجمہ کر کے پوری کی گئی، اس بنا پر ان اطبا کو اگر "یورپ کے ابتدائی معلمین طب" کے لقب سے یاد کیا جائے تو بالکل بجا ہے۔ اہل یورپ بارھویں صدی کو "دور تجدید" کہتے ہیں۔ کیونکہ اس صدی میں انھوں نے عربی کی مختلف علمی کتابوں کا ترجمہ لاطینی اور فرنچ میں کیا۔ فی الحال ہمارے پاس کوئی اس قسم کا مکمل تذکرہ موجود نہیں جس سے ان تمام اطبا کا استقصا کیا جائے۔ جنھوں نے یورپ پر طبی احسان کیا تاہم ان میں سے دو تین ہستیوں کے متعلق تمام کتابوں میں اشارے موجود ہیں اور ان کی طبی خدمتیں اور خیالات اختصار کے ساتھ قلمبند کرنا مناسب نظر آتا ہے۔

(۱) **ابوبکر محمد بن زکریا رازی**، یہ شخص موسیقی، ہندسہ، منطق اور طب کا امام وقت تھا پہلے رے پھر بغداد کے شفاخانہ کا رئیس الاطبا مقرر ہوا۔ ابن ندیم نے الفہرست میں اسکی تصنیفات کی تعداد ۲۱۲ بتائی ہے جن میں سے بارہ صرف علم کیمیا پر مشتمل ہیں۔ طب میں انکی مشہور ترین کتابیں الحاوی، المنصوری، کتاب الاعصاب، کتاب الجامع ہیں، ان میں سے الحاوی اور المنصوری کا ترجمہ بارھویں صدی میں لاطینی میں ہوا اور اسی وقت سے یہ دونوں کتابیں یورپ کے کالجوں کے طبی نصاب کے لئے مستند قرار دی گئیں۔ الحاوی جو ابن خلکان کے اندازہ کے مطابق تقریباً تیس جلدوں میں تھی۔ جالینوس کی تمام کتابوں کا لب لباب ہے۔ المنصوری اگرچہ نسبتہً بہت مختصر کتاب تھی۔ تاہم مقبول عام ہوئی اور خاص و عام نے اسے پسند کیا اس کو مصنف نے اس کا نام ابو صالح منصور بن نصر سامانی کے انتساب سے المنصوری رکھا۔ رازی نے چیچک کی تحقیق میں بھی ایک رسالہ لکھا جس کا ذکر پیشتر ہو چکا ہے۔

ابن خلکان کی تحریر کے مطابق رازی کیمیا گری کا قائل تھا۔ اور اسکی تائید میں منصور کیواسطے ایک رسالہ لکھا جسمیں

خوش ہو کر اسے ایک ہزار دینار دیا۔ پھر کہا کہ اس کتاب کے نسخوں کو تم عملی صورت میں لا کر صحیح ثابت کر دو اور اس مقصد کی تکمیل کے واسطے جو کچھ آلات اور جڑی بوٹیاں وغیرہ مصنف نے مانگیں، اس بادشاہ نے مہیا کر دیں۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ تمام نسخے غلط ثابت ہوئے اور نہ تو پیتل سونا ہوا اور نہ ٹین یا رانگا چاندی بنا تو منصور بہت غضبناک ہوا اسے کوڑے لگائے۔ اور کتاب مذکور اس کے سر پر زور سے دے ماری جس سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور ضرب سے رازی کی آنکھ میں موتیا بند کا مرض پیدا ہو گیا۔ چنانچہ وہ کچھ عرصہ بعد اندھا ہو گیا۔ اس کی وفات سنہ ۹۳۲ء میں ہوئی۔ اور یہ وہ سال تھا جس میں خلیفہ مقتدر باللہ کا بھی انتقال ہوا۔

رازی نے علم طب میں جراحی اور ادویہ کی ترکیب کے سلسلے میں بہت اہم اضافے کئے۔ اس کا علم تشخیص اور علم الاسباب والعلامات بھی بہت زیادہ ممتاز و مشہور ہیں۔ لیکن ان کا وہ حصہ جس میں قارورہ کی علامتوں اور ستاروں کے جسمانی صحت پر اثر ڈالنے سے بحث کی گئی ہے، اس سے مستثنیٰ ہے۔ علم تشریح اور فزیالوجی میں اس کی تمام رائیں بعینہٖ جالینوس کی رائیں ہیں اس کا قول ہے :-

"جب غذا کے ذریعہ سے علاج ہو سکے، تو دوا کے ذریعہ سے نہیں کرنا چاہئے! اور جب مفرد دوا سے مریض اچھا ہو سکے تو مرکب دوا اسکو نہیں دینی چاہئے اگر طبیب اپنے فن کا ماہر ہو اور مریض اس کی بات مانے تو ممکن نہیں کہ مرض جلدی دور نہ ہو۔ علاج مرض کے شروع میں کرنا چاہئے اور دوا ایسی ہو جس سے قوت کم نہ ہو۔

(۲) ابو علی حسین بن عبداللہ جو بالعموم بو علی سینا کے نام سے مشہور ہے بخارا کے قریب ایک گاؤں میں سنہ ۹۸۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ بخارا میں اس نے حساب ہندسہ، جبر و مقابلہ، منطق اور فلسفہ میں کمال حاصل کرنے کے بعد طب کی جانب توجہ کی اور کتب طبیہ کے متواتر مطالعہ اور اپنی ذاتی تحقیقات کی بدولت وہ مرتبہ حاصل کیا کہ دنیا اسے "شیخ الرئیس" کے لقب سے پکارنے لگی۔

یوں تو اس کی تصنیفات کے متعلق بعضوں کا قول ہے کہ سو کے قریب تھیں۔ لیکن ان میں شہرت محض معدودے چند کتابوں کو ہوئی۔ اس کی طبی تصنیف "القانون فی الطب" کو جو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ شاید ہی کسی طبی کتاب کو حاصل ہوئی ہو جیسے ہی اس کا ترجمہ بارہویں صدی میں لاطینی زبان میں ہوا اپنے حسن ترتیب اور سہل الفہم ہونے کی بنا پر اس قدر پسند کی گئی کہ یورپ کے مختلف کالجوں میں اس وقت سے لیکر سترہویں صدی عیسوی تک ایک مستند اور قابل اعتماد کتاب کی حیثیت سے داخل نصاب رہی۔ علمی اداروں میں جالینوس، رازی اور مجوسی کی مولفات کے بجائے سب لوگ اسی کو استعمال کرنے لگے۔ عربی نسخہ زیور طباعت سے سب سے پہلی مرتبہ یورپ ہی کے ایک خطہ یعنی روما میں سنہ ۱۵۹۳ء میں مزین ہوا [illegible] اس وقت اس کا شمار قدیم ترین عربی کتب مطبوعہ میں تھا اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ ابھی حال میں انگریزی

میں ہوا ہے۔ "القانون" میں طب کی دونوں قسمیں یعنی نظری اور عملی کے قوانین کلیہ پر بحث کی گئی ہے پھر ادویہ مفردہ کے کلی اور جزئی احکام پر مبسوط گفتگو کی گئی ہے اس عنوان کے ضمن میں شیخ نے بہت سی عجیب و غریب دواؤں مثلاً کہربا کا فولاد لوہے کی مختلف شکلوں، سونا اور چاندی کا ذکر کیا ہے، وہ سونے اور چاندی کو مصفی خون سمجھتا ہے اس بنا پر اسکی رائے میں سونے اور چاندی سے ملمع کی ہوئی گولیاں زیادہ مفید و موثر ہیں۔

علم الامراض کے ضمن میں اس نے دماغی بیماریوں کا خصوصیت کے ساتھ بہت مفصل تذکرہ کیا ہے اور چہرہ کے اعصابی درد، کزاز، سینے کی تین مختلف قسم کی جلن (INFLAMMATION) ذات الجنب کی مختلف شکلوں، عضلات پر اثر ڈالنے والے وجع مفاصل، خسرہ، اور نیلے داغ والی بیماری (PURPLES) کے متعلق بالکل نئی اور محققانہ بحث کی ہے۔ ایک جرمن مستشرق "لایخ منسٹرن" کہتا ہے کہ پہلے اسی کو مرض سِل کے متعدی ہونے کا علم ہوا۔ اسی طرح روزمرہ کی عام بیماریوں کے متعلق بھی اس نے عجیب و غریب باتیں دریافت کیں۔ مثلاً اس نے درد کی پندرہ قسمیں بتائیں، اور ان کے درمیان صحیح امتیاز قائم کیا۔ جالینوس کا یہ نظریہ کہ تمام قدرتی بیماریاں اخلاط کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اس کے نزدیک کسی دوا کا ایک ملک یا شہر میں مفید ہونا اور دوسرے ملک یا شہر میں مضر ہونا ممکن ہے۔

جراحی کے ضمن میں اس کی رائے ہے کہ آنکھ سے دھندھ نکالنے کا محفوظ طریقہ یہ ہے کہ سوئی سے دبا کر نکالا جائے، دوسرے ایسے قسم کے عملیات سے اسے نکالنا خطرناک ہے۔ درد اور تکلیف والے فتق (STRANGULATED HERNIA) میں جراحی عمل نامناسب ہے مثانہ کا پانی نکالنے کے واسطے اس میں سوراخ کرنے گلے سے آتر نے والے جونک یا زندہ جانوروں کے نکالنے، کان کا میل اور الائش صاف کرنے اور اس قسم کے دوسرے عملیات کو اس نے مفصل طریقہ سے بیان کیا ہے اس کا خیال ہے کہ دانتوں کو زنبور سے اکھاڑنے کے بجائے اگر ان کی جڑوں میں ایک قسم مینڈک (TREETOAD) کی چربی لگادی جائے تاکہ وہ ڈھیلے ہو کر خود گر جائیں تو بہتر ہے علم التولید (OBSTETRICS) میں وہ اپنے پیشرو مصنفین کا مقلد ہے

"ایک دوسرا جرمن مستشرق فروخ کہتا ہے کہ اس نے لڑائی اور مار پیٹ کے زخم اور چوٹ کے متعلق بہت کم جراحی عمل لکھے اور جو لکھا۔ وہ محض یونانیوں سے لیا جس میں اسنے اپنی ذاتی رائے بالکل نہیں ظاہر کی۔"

اس کی وفات ۴۲۸ھ میں ہوئی۔

(۴) ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی۔ گیارہویں صدی عیسوی میں اندلس کی ممتاز طبی ہستیوں میں سے تھا۔ بہ نسبت طب کے اس کو جراحی میں زیادہ کمال حاصل تھا اور وہ جراح کی حیثیت سے اتنا ہی مشہور تھا ہو ابو علی سینا طبیب کی حیثیت سے وہ فن تشریح میں بہت زیادہ ماہر تھا۔ اور کہتا تھا کہ اس فن کی واقفیت سے جراحی میں بہت زیادہ .... مدد ملتی ہے اس نے اپنی ذہانت اور ذکاوت سے جراحی کے واسطے بیسوں آلات اور مشینیں ایجاد کیں، طب میں بہت سی مفید کتابیں لکھیں۔ جن میں سے ایک محض زنانہ امراض کے مباحث پر مشتمل تھی نیز دوا سازی میں بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ بارہویں صدی میں لاطینی میں ہوا اور مغربی مدارس میں درسی کتاب کی حیثیت سے داخل ہوئی اصل کتاب پہلے وینس میں ۱۴۷۱ء میں چھپی۔

اس کی مشہورترین تصنیف "التصریف لمن عجز من تالیف" ہے جو طب نظری اور طب عملی کی ایک مبسوط کتاب ہے اس کتاب کے ان اجزا کو جو علم جراحت پر مشتمل تھے بارہویں صدی میں لاطینی کا جامہ پہنایا۔ اور وہ سلرنو اور مونپلیہ وغیرہ کے کالجوں میں داخل نصاب ہو گئے۔

عرب اطبا کے دستور کے موافق اسکی تجویز ہے کہ بیماری کی حالت میں فصد صحیح و سالم پہلو پر لیجائے۔ نیز اس کا خیال ہے کہ فصد تندرست آدمی کو بہت سی بیماریوں سے بچاتی ہے علاوہ ان بیماریوں کے جو اسکی مذکورہ بالا طبی کتاب کے جراحی مباحث میں مذکور ہیں۔ اس نے سرخ مادہ اور بڑھے گوشت کے واسطے بھی جراحی علاج تجویز کیا۔ ٹوٹی ہڈیاں وہ آلات کے ذریعہ سے درست کرتا تھا۔ زخموں کو داغ کر اچھا کرنے کے مسائل پر اس نے مفید ترین اصولی اشارات تحریر کئے ہیں

آثار عتیقہ بہار

از مولوی محمد یٰسین صاحب ندوی، بانکی پور، پٹنہ

صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں "بارہ گانواں" ایک مشہور معروف جگہ ہے۔ یہ ان سادات کے بارہ گاؤں ہیں
ایک بزرگ سید احمد شاہ جاجنیری سے اپنا انتساب رکھتے ہیں۔ سید صاحب کون تھے و کیا تھے؟ اس بارے میں تاریخ
روایت یہ ہے۔

(سید شاہ جاجنیری) دہلی آکر سکونت پذیر ہوئے مگر سلطان قطب الدین ایبک کے زمانہ میں بہار
کے راجہ اندرون نامی نے موضع اودرین کے مسلمانوں کو جرم گاؤکشی میں ذبح کیا۔ جب یہ سلطان
نے مولانا نور الدین کی قیادت میں ۱۰ ہزار سپاہیوں کا لشکر جرار اودرین پر بھیجا۔ اس لشکر کے کئی سردار
تھے، ان میں سے ایک جلیش کے سپہ سالار غیاث میاں صاحب (سید نذیر احمد صاحب محدث دہلوی)
کے جد اعلیٰ سید احمد شاہ جاجنیری تھے خدا کے فضل سے لشکر فتحیاب ہوا اور سالار لشکر مولانا نور الدین نے
فوج اور افسروں کو حکم دیا کہ جو شخص یہاں سکونت اختیار کرنا چاہے ہماری طرف سے اس کو اجازت
ہے اس پر جن لشکریوں نے بہار کی سکونت اختیار کر لی۔ ان میں سے ایک سید احمد شاہ جاجنیری
تھے جنہوں نے موضع ایکساری کو پسند کیا تھا"

صفحہ ۱۳۳
علمائے حدیث ہند
مولفہ ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی

اسی بارہ گانواں میں ایک گاؤں چوارہ بھی ہے جو شیخپورہ کے مشرقی جانب چھ سات میل پر واقع ہے یہاں کے تاریخی حالات
و آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گاؤں ایک صدی پیشتر علما اور بزرگان دین کا گہوارہ تھا جن کے مزارات اور مقبرے اب بھی
بکثرت موجود ہیں۔ انہیں مقبروں میں اس کے جنوبی جانب ایک بہت بڑا مقبرہ ہے جس میں بہت سی قبریں ہیں جو اکثر پختہ ہیں
اس مقبرہ کی مشرقی جانب پختہ چہار دیواری کا ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں یکے بعد دیگر چار پانچ پختہ قبریں ہیں۔ ان میں

سے تین قبروں پر سفید سنگ مرمر کے کتبے لگے ہوئے ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔ وسط میں جو قبر ہے اس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہوا ہے:۔

هوالله الباقی

وحید عصر فرید زمانہ یتیم اللہ ۔　مہ سپہر ذکا عالم فرشتہ خصال

نبیہ عارف وتحریر وفاضل نقاد　محیط دائرہ فضل ومرکز اجلال

گل ریاض سیادت جناب والدین　کہ غنچہ دار بوصفش زبان ناطقہ لال

بسوئے باغ جناں رفت سینہ عالم　۔۔۔۔۔۔ شدہ چاک از وفور حزن وملال

طلب چو سال وفاتش نمودم از دل گفت　کہ آہ آہ بدنیا نماند فضل وکمال

آنجناب از اولاد حضرت امام باقر از سادات ترمذ از نحاریر علمائے روزگار واجلۂ کبار بود در علم معقول ومنقول یتا در علم فقہ وحدیث وتفسیر وکلام واصول یگانۂ زمانہ ولادت آنحضرت در سال یکہزار ویکصد وپنجاہ ہجری ست سی سال تحصیل وتکمیل علوم ظاہر بدل ہمت نمودہ وبتحقیق دقائق علوم نظری وبدیہی وحل غوامض طبیعی والہی وتدقیق وتطبیق خلافیات اصول وفروع مذاہب وادیان گوے سبقت از امثال واقران بردہ بلکہ در کیف بعضے متعلقات مسائل کہ باذکار علماء سلف نکشودہ بحکم فضلنا بعضکم علی بعض متفرد گردید وبجید بوفور خواہش بادشاہ وقت بمعظمات خدمت سلطان زماں ماند من بعد باقتضائے طبیعت اصلی وفیضان صحبت بعضے مقتدایان طریقت باکتساب معارف حقہ یقینیہ وعلوم باطنیہ ترکہ وتجرید گزیدہ چہل سال بریاضت ودرس تفسیر وفقہ حدیث بسر بردہ ودر سنہ ۱۲۲۱ ہجری انتقال فرمودہ واین کتابہ وتعویذ را شجاع الدین علی ابن آنجناب در دار الخلافہ شاہجہان آباد کہ عہدہ حکومت عدالت آنجا باخدمت افتائے صدر داشت در سنہ ۱۲۲۶ ہجری ودر سنہ ۱۲۲۵ فصلی وسنہ ۱۸۲۱ سمت ۱۸۷۸ مرتب گردانید ہمدرین سال محمد یحییٰ ولد آنحضرت کہ فاضل ذکی الطبع وبصفات حمیدہ بود وخدمت عدالت غازی پور داشت وفات نمودہ وبجوار والد بزرگوار مدفون شد انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

مذکورہ بالا کتبے سے صاحب قبر کی سوانح کا ایک مختصر سا خاکہ ذہن میں آجاتا ہے اس کتبہ میں جن دو نام اور ملتے ہیں شجاع الدین علی اور محمد یحییٰ ان دونوں کے حالات بھی اسی کتبہ سے روشنی میں آجاتے ہیں۔

شجاع الدین علی صاحب دار الخلافت دہلی میں قاضی القضاۃ یا صدر الصدور اس زمانہ میں تھے جبکہ سارا

ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں ہو چکا تھا۔ اور خاندان مغلیہ کی حکومت کا دم واپسیں تھا۔ صرف نام کے بادشاہ اور نام کی بادشاہت رہ گئی تھی یعنی اکبر شاہ ثانی کے عہد میں اسلئے قاضی صاحب بھی صرف نام ہی کے قاضی ہوں گے، قاضی صاحب عہدۂ قضیات کے ساتھ "خاں بہادر" کے اعزاز سے سربلند کئے گئے۔ مگر اس عہد کی سرکاری ملازمتیں دیندار وں کے نزدیک بری نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں۔ چوارہ کے بڑے بوڑھے بیان کرتے ہیں کہ قاضی صاحب کے والد بزرگوار یعنی مولانا نعیم اللہ صاحبؒ ان کے اس عہدہ سے بہت ناخوش تھے! انہوں نے بار بار قاضی صاحب سے اصرار کیا کہ یہ انگریزوں کی غلامی ہے۔ تم اس عہدہ سے استعفا دیدو لیکن قاضی صاحب اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ انکی اس نافرمانی سے مولانا اتنے خفا ہوئے کہ زندگی بھر کے لئے قاضی صاحب سے قطع تعلق کر لیا۔ اور ان کی کمائی کو اپنے لئے حرام سمجھ لیا۔ اگر قاضی صاحب کے گھر سے کوئی چیز تحفتہً جاتی تو اسکو قبول نہیں کرتے۔ اور فرماتے کہ مجھکو اس سے حریت کی بو آتی ہے اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو پھر میرے دل میں مولانا کا احترام اور ان کی عزت وقعت اور بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ انہوں نے اس شان کو برقرار رکھا۔ جو ایک سچے دیندار مسلمان کی ہونی چاہئے۔

بہرحال قاضی صاحب کی شادی دار الخلافت دہلی میں لال قلعہ کی ایک شہزادی گیتی آرا بیگم سے ہوئی تھی جن کا انتقال چوارہ ہی میں ہوا۔ اور اسی احاطہ کی مشرقی جانب سپرد خاک ہوئیں، ان کے مزار پر بھی سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا کتبہ نصب کیا ہوا ہے جس کے حروف ابھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ ہے :۔

"فاعتبروا یا اولی الابصار"

این مزار سراسر حیرت و اعتبار نواب گیتی آرا بیگم بنت رفعت النسا بنت شاہ عالم بادشاہ ہندوستان کہ در قلعہ سرخ پیدا و پرورش یافتہ و بسبب نکاح با سید شجاع الدین علیخاں بہادر رضوی دریں خاندان مدفون گردیدہ و تاریخ سال انتقال از مصرع اخیر قطعہ بعبارت ظاہر و بحساب ابجد بہ می آید

گیتی آرا بیگم شہزادی عالی نسب ۔ چون ازیں عالم بسوی خانۂ عقبیٰ
سال تاریخش چو پرسیدم ز دل ہاتف بگفت ۔ یکہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت ہجری بود

۱۲۵۸ھ

قاضی صاحب کا انتقال بھی چوارہ ہی میں ہوا۔ اور اسی احاطہ کی مغربی جانب مدفون ہوئے ان کی قبر پور ی سنگ مرمر کی ہے قاضی صاحب کے مزار پر بھی سفید اور چمکدار سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا کتبہ لگا ہوا ہے جو نظم میں ہے

کہیں کہیں ایک دو سطریں نثر میں ہیں لیکن افسوس ہے کہ ایک صدی گذر جانے کے بعد اسکے حروف اس قدر محو ہو گئے ہیں کہ کسی طرح نہیں پڑھے جاتے بڑی دقتوں کے بعد پہلا شعر پڑھا گیا اور وہ یہ ہے :-

اے زایر خاک مرقد من ہشدار ازیں رہ خطرناک

قاضی صاحب کی قبر کے پہلو میں ایک چھوٹی سی قبر اور ہے جس پر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قبر قاضی صاحب کے اس بچے کی ہے جو گیتی آرا بیگم کے بطن سے تولد ہوا تھا۔ اور جو دس گیارہ برس کی عمر میں انتقال کر گیا مولانا یتیم اللہ کے مزار مبارک کے پہلو میں ان کے چھوٹے صاحبزادے قاضی یحیٰ صاحب قاضی غازیپو کی قبر ہے اس پر بھی کوئی کتبہ وغیرہ نہیں ہے۔

یہ قاضی صاحب اور ان کی رفیقۂ حیات شہزادی گیتی آرا بیگم کا ایک مختصر سا تعارف ہے ان دونوں کے مفصل حالات زندگی مجھے نہ مل سکے، اپنی بساط بھر تاریخ کی کتابوں کی چھان بین کی لیکن کامیابی نہ ہوئی "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے"

لال قلعہ کی شہزادیوں میں مجھے اس نام کی کوئی شہزادی بھی نہ ملی۔ البتہ خدا بخش خاں لائبریری میں ایک قلمی نسخہ "عبرت نامہ" کے نام سے ہے اس میں ایک جگہ شاہ عالم کے تذکرہ میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"بادشاہ زادہ یعنی شاہ عظیم الشان بہادر با گیتی آرا بیگم بنت محمد اعظم شاہ واقع شد"

اسی طرح قاضی صاحب کا تذکرہ بھی تاریخ کی کسی کتاب میں مجھے نہیں ملا۔ اگر ان کے مزار کا کتبہ پڑھا جاتا۔ تو اس سلسلہ میں بہت سی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں لیکن ابھی اوپر کہہ چکا ہوں کہ وہ مجھ سے نہیں پڑھا گیا۔ تعجب ہے کہ سر سید نے بھی اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے، ہاں جامع دہلی میں ایک جگہ ہندوستان کا نقشہ بنا ہوا ہے اور اسکے نیچے حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے۔

"در عہد حضرت محمد اکبر بادشاہ غازی ۱۲۲۳ ہجری بایمائے شاہزادہ عالیجاہ محمد سلیم بہادر، قاضی شجاع الدین بہادر چاروی درست کردہ یادگار گذاشت"

اس کے علاوہ مجھے اتفاق سے ایک چھوٹا سا قلمی رسالہ "صورۃ المناظرہ" کے نام سے دستیاب ہوا ہے اس میں بھی قاضی صاحب کا ایک دو جگہ نام آتا ہے اس رسالہ میں اس مناظرہ کی کاروائی ہے جو ۱۲۴۰ھ میں جامع مسجد دہلی میں "وہابیوں" اور "بدعتیوں" کے درمیان ہوا تھا۔ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

صورت مجلس مناظرہ از مولانا مولوی عبدالحی صاحب و مولانا جناب رشید الدین خاں صاحب وغیرہ

علما و فضلا شاہجہان آباد در جامع مسجد شاہجہان آباد معروف دہلی کہ بتاریخ بست نہم شہر ربیع الثانی سنہ ۱۲۳۰ ہجری واقع گردید برائے استفادۂ خاص و عام و بہ نظر منقولی کلام زیب انجام وہابیان غیر مقلدان فی زمان بہم رسانیدہ شایع گردانیدہ"

اور خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے :-

"تمام شد صورت مجلس مناظرہ جامع مسجد شاہجہان آباد دہلی فقط۔ کاتب شیخ محمد غوث ولد شیخ فیاض علی مرحوم عبداللہ ولد سید بابو ظہور حسین مرحوم چاروی و مالک این نسخہ عاصی سید ... بخش ولد سید احمد بخش مرحوم ساکن موضع چارہ پرگنہ امر تھو ضلع مونگیر"

قاضی صاحب کے متعلق اس رسالہ میں حسب ذیل عبارت ہے :-

مفتی اپیل مولوی سید شجاع الدین علی خاں صاحب چاروی گفتند کہ تصفیہ این مسایل ضرور است زیرا کہ بسبب اینہا شورش عظیم و مباحثۂ فخیم میان مردم افتادہ"

اسی طرح اس میں ایک جگہ اور حاضرین مجلس مناظرہ میں قاضی صاحب کا نام آتا ہے۔

ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں جناب رخشاں ابدالی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "اردو نثر کی ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ" شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے قاضی صاحب کی ایک اردو تصنیف کا ذکر کیا ہے، جس سے انکی علمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ کتب خانہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں قاضی صاحب کی اردو زبان میں ایک کتاب ہے جو ۱۲۵۸ھ میں چھپ کر شائع ہوئی تھی، اس کتاب کا سرورق غائب ہے اس لئے رخشاں صاحب اس کا نام نہیں بتا سکے۔ اس کے خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے :-

"تمام ہوئی سوہویں ذی الحجہ کو ۱۲۵۸ھ روز جمعہ مطابق ... جنوری ۱۸۴۳ء مسیحی میں بانطباع شیخ محمد دین توطن چھپرہ کے تکمیل پایا"

اس کتاب میں ملا کرامت علی جونپوری کی کتاب (قوۃ الایمان) کا رد ہے، جو تعزیہ داری کی مخالفت میں لکھی گئی تھی یعنی قاضی صاحب نے یہ کتاب تعزیہ داری کی جواز میں لکھی تھی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب اہل بیت رضوان اللہ علیہم کے غلو میں حد اعتدال سے نکل گئے تھے، تمہید کے بعد لکھتے ہیں :-

"... ... ... تحسین ترتیب و فیضان صحبت والد ماجد علیہ الرحمۃ کے فی الجملہ علوم ضروریہ صرف و نحو و فقہ و عقائد و علم کلام و اصول دین و تفسیر و حدیث سے بہرہ رکھتا ہے۔ و بایمان حقیق و تحقیق مانند بزرگان خود پیراستہ حنفیہ

تقلیدی سے وارستہ۔ ۔ ۔ ۔ ..محبت خدا و رسول و اہل بیت نبوت و تبعیت کتاب اللہ و سنت دین و ایمان ہمارا ہو تعصب و نفاق و عداوت اہلبیت نبوت کو موجب شقاوت دارین و ضلالت نشاتین جانتا ہے یعنی بے تعصب و شیعہ تبرا مذہب آبائی ہمارا ہے"۔

اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب اس سے پہلے تین کتابیں اور ردّ نصاریٰ میں لکھ کر شائع کر چکے تھے، لکھتے ہیں:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے یہ ہیچمدان نے ایک کتاب مدلل بالطال مذہب نصرانی کے و اثبات مذہب اسلام کے تصنیف کرکے بصرف ایک ہزار پانچ سو روپے کے پانچ سو نسخہ چھاپ لوگوں کو تقسیم کیا، اور نام اس کا تحفۂ مسیحیہ......رکھا و بیس نسخہ اس کا دارالامارہ کلکتہ میں بھیجا، لیکن کسی نے جواب اس رسالہ کا مدلل نہ لکھا، مگر بعضوں نے کچھ تاویل و توجیہ اپنے اس عقیدہ متناقضہ باطلہ کا لکھا، اور ایک کتاب کئی پادریوں نے ولایت میں متفق ہو کر ابطال جمیع مذاہب و ادیان غیر عیسویہ اپنے خیال فاسد میں کیا ہے، ہمارے یہاں بھیجا، نظر بر آں اس ہیچمدان نے رد و ابطال ان دونوں رسالہ جہالۂ کفر و ضلالت کا جدا جدا لکھا، و بفضل الہی یہ تینوں کتابیں بابطال عقیدہ باطلۂ تثلیث در توحید و در تثلیث مذہب عیسائی کے کافی و وافی ہے"۔

افسانۂ حاضرہ:-

فیروزی ساری

از جناب نثار احمد صاحب ناروی، الہ آباد

سودیشی نمائش کا آج آخری دن تھا۔ اول تو آخری دن نمائش کو ایک سال خیر باد کہنے کے لئے یوں ہی کافی سے زیادہ مجمع ہو جاتا ہے نہ کہ جب ترتیب دہندگان نے آج کے لئے آتشبازی کا خاص پروگرام شائع کر کے غالباً سارے شہر کو نمائش گاہ میں کھینچ لیا تھا۔ پھر آج کی چہل پہل بھیڑ بھاڑ اور خرید و فروخت کی گرما گرمی کا کیا کہنا۔ ایک خاص بات جو ہر شخص محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ تھی کہ مجمع میں صنف نازک کا عنصر اس قدر غالب نظر آتا تھا کہ مردوں کے مقابلہ میں یقیناً چار اور ایک کی نسبت قائم ہوتی تھی۔ پہلے تو میں نے خیال کیا کہ شاید اس شہر میں حوا کی بیٹیاں زیادہ آباد ہیں تاہم مجھے تعجب تھا کہ اس قدر جنس مقابل کی کمی شہری کاروبار نظم و نسق کو کس طرح پورا کر سکتی ہے۔ میں نے اپنی اس حیرت کو فضل صاحب سے ظاہر کیا جو میرے ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ مرد اپنے مکان کی حفاظت کرنے کے لئے گھر رہ گئے ہوں۔ غرض اس رنگ و بو کی دنیا نے اس مسئلہ میں زیادہ غور و فکر کی اجازت نہیں دی۔ اول تو نمائش گاہ کی تمام شی

برقی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لئے کیا کم تھیں کہ مزید برآں دوکانوں کے بڑے بڑے قمقموں نے سارے احاطہ کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ فضا کی گرد کا ذرہ برقی انعکاس سے جگمگا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قارون کے خزانۂ زر کو قدرت نے ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں بکھیر دیا ہے۔ یہ نورانی فضا ایسی لطیف تھی کہ انسانی جسم کا سایہ مفقود ہو گیا تھا۔ جنس لطیف کے اجسام کی لطافت اس سیلاب نور میں روشنی کے درآمد اور برآمد کی قابلیت کا مظاہرہ کرتی معلوم ہوتی تھی۔ ریشم کی ہلکی ہلکی ساریاں اور پھران کے بجلی کی طرح کوندجانے والے زریں کنارے۔ رنگین رخساروں کو چھو چھو کر کانپ اٹھنے والے کانوں کے صدف آسا آویزے۔ خنداں و تاباں پیشانی اور پھران سے ذرا بالا زلف پیچاں کی ہزار ہا اداؤں کے ساتھ انکی دلکش آرائش اور ان کے ساتھ عطریات کی مبہوت دیوانہ بنانے والی نکہت بیزیاں سب یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمین کا یہ عنصر رنگا رنگ اڑ جائے گا۔

مجمع کی زیادتی کی توقع نے نمائش گاہ کے خصوصاً

س حلقہ کو جہاں آگ سے کھیلنے کی اسکیم بنائی گئی تھی زیادہ
ںکلف بنادیا تھا۔ نشست و برخاست کے خاص قواعد
رتب کئے گئے تھے۔ حلقہ کے اندر داخل ہونے کے لئے ایک
آنہ کا ٹکٹ تھا۔ یہ ٹکٹ صرف ان کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے تھا جو
وہاں لگی ہوئی تھیں ورنہ یوں تو باہر سے بھی ہر شخص دیکھ
سکتا تھا۔ ہم اور فضل صاحب جب ٹہلتے ٹہلتے اس جانب
ہونچے تو سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ ٹکٹ خرید لیں
ب اطمینان کے ساتھ وہاں جاکر بیٹھیں۔ اس لئے کہ ہر
رف بھیڑ بہت تھی۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر پہونچنے کے بعد
یک اضطراب شوق کے ساتھ دونی جیب سے نکالی اور جنگلے
ں ہاتھ ڈالکر کہا "دو ٹکٹ دے دیجئے گا"۔ مگر ابھی تک
نہ دیکھا تھا کہ میرا مخاطب کون ہے۔ اور میرا ہاتھ کس قدر
سارت کر رہا ہے؟ کہ میری نظر ایک فیروزی ریشمی ساری
پڑی جو ایک حسین مجسمہ کو ملفوف کئے ہوئے تھی۔ اس کے
م بلعیت کا شہابی رنگ فیروزی رنگ کی ساری سے
ان ہو رہا تھا۔ جلد کی مخملی نرمی ریشم کی لطافت کو مات
رہی تھی۔ میرا ہاتھ اس کرسی کے قریب تک پہونچ چکا
جس کو یہ دیوی اپنی نشست سے مزین کئے تھی اور
کے اس حصہ پر تھا جہاں روپیوں اور پیسوں کا ایک
رلگا تھا۔ وہ میری اس عجلت پر مسکرا رہی تھی۔ اس کا
سم ہونا میرے لئے بڑا ہی حسین منظر تھا۔ اس کی روشن
انی پر چاندی کا ٹیکا یا بندی اس کے شگفتہ حسین چہرہ پر
سنے عکس [illegible] کے آغوش میں الماسی دانت ایک
جانفزا منظر پیش کر رہے تھے۔ اس کی برق پاش نگاہیں
ابھی مجھ پر بجلیاں گرا ہی رہی تھیں کہ وہ ایک مترنم آواز کے
ساتھ یوں گویا ہوئی۔
"آپ کا اسم شریف"؟
میرے کانوں نے خوب اچھی طرح سنا کہ وہ میرا نام دریافت
کر رہی ہے۔ مگر یہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اس کو میرے نام
سے کیا غرض؟ شاید میں نے غلط سنا۔ یہ سوچکر فوراً
جواب دیا:۔
"جی ہاں۔ دو چاہئیں"۔
میرے اس گھبرائے ہوئے جواب کو سنکر اس کا چہرہ ماہ کامل
کی طرح چمک اٹھا اور ایک مختصر نقرئی قہقہہ کے بعد پوچھا۔
"کیا آپ دونوں ٹکٹ اپنے ہی لئے خرید رہے ہیں"۔
میں نے کہا "نہیں۔ ایک آپ کے لئے (فضل صاحب کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے جو میرے قریب کھڑے تھے)۔
"آپ کا اسم شریف"؟
دوبارہ یہ سوال سنکر میں پریشان ہوا کہ آخر اس تفصیل اور
جرح کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں
کسی نتیجہ پر پہونچتا میں نے کہا "آفاق"۔
اس نے پھر دریافت کیا "میں نہیں سمجھی مس آفاق یا مسز آفاق"
یہ سوال سنکر میں اور بھی حواس باختہ ہو گیا۔ چہرہ پر ہوائیاں اڑنے
لگیں۔ میں کلین شیوڈ تو ضرور تھا مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ
میری جنسیت کے پہچاننے میں دشواری ہو۔ سمجھ میں نہ آتا
تھا کہ آخر اس کا کیا جواب دوں۔ ایک لمحہ کے تامل کے بعد

منتشر ہوا اس کو بجا کرکے میں نے کہا کہ اگر گستاخی معاف فرمایئے تو میں یہ دریافت کروں کہ یہ سوالات کس نوعیت کے ہیں اور ان سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

اس نے یہ سنکر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کھڑکی کے اوپر جو تختی آویزاں ہے اسکو پڑھئے اور پھر اگر ضرورت سمجھئے تو ٹکٹ خریدیئے۔"

میں نے تختی کو پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔ "صرف عورتوں کیلئے" یہ دیکھ کر میں اپنی جلد بازی پر سخت پشیمان ہو رہا تھا۔ کہ میں نے دیکھا کہ وہ کافرہ میری خفت پر مسکرا مسکرا کر خوب لطف اندوز ہو رہی ہے "وہ کسی گل پیرہن کا مسکرانا ہائے ہائے"۔

ہم لوگ وہاں سے افتاں وخیزاں چلے اور ٹکٹ گھر سے دور جا کر ایک جگہ کھڑے ہو کر آتش بازی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ میں اس وقت دو قسم کے خیالات میں مستغرق تھا۔ اول تو اپنے بیوقوف بنائے جانے کی خفت دوسرے اس حسین چہرہ کا مسکراتا ہوا دلکش تصور کہ یکایک بھیڑ کا ایک ریلا اس زور سے آیا کہ تمام کی حد بندیاں ٹوٹ گئیں اور تمام آدمی اس حلقہ کے اندر گھس گئے ہم لوگ بھی اس ریلے میں بہتے چلتے وسط حلقہ تک پہونچ گئے آدمیوں کی کثرت نے عورت اور مرد کا امتیاز اٹھا دیا تھا۔ ہاں اتنا البتہ تھا کہ ایک طرف عورتیں نسبتہً بہت زیادہ نظر آتی تھیں۔ میں اور فضل صاحب بالکل اتفاق سے اس جگہ آ پڑے تھے جہاں عورتوں کا اجتماع بہ نسبت مردوں کے زیادہ تھا۔ اب حلقہ کے تمام برقی قمقمے بے نور ہو چکے تھے

اور انسان نے اپنی عقل کے معمولی کرشموں کے مظاہرہ کیلئے اپنی ادنیٰ حرکت سے آتشی چنگاریوں کو قوت پرواز دیکر فضا میں رقصاں کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس کی رنگینی سے فضا کبھی بالکل سبز پوش اور کبھی سرخ پوش نظر آنے لگتی تھی۔ فضل صاحب میرے دائیں جانب کھڑے تھے۔ ہم لوگ آسمان تاروں کی بلند پروازیاں انار کا آتشیں فوارہ اور چرخی کا رقص دیکھنے میں ہمہ تن محو تھے۔ اس اثنا میں یہ کثیر انبوہ کبھی فرط انبساط و جوش اشتیاق سے آگے بڑھتا اور کبھی چنگاریوں کی زد سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹتا۔ ہم لوگ بھی اسی سیلاب میں ادھر ادھر تھپیڑے کھا رہے تھے کہ مجھکو محسوس ہوا کہ میرے پہلو اور بازو کے درمیان کوئی چیز جگہ چاہتی ہے۔ خیال ہوا کہ فضل کا ہاتھ ہے فوراً پہلو کو کشادہ کر دیا اور اس ہاتھ کو اپنے بازو کے درمیان لے لیا اور پھر اطمینان سے اپنے آتشی مناظر میں گم ہو گیا۔ اسی طرح تقریباً ایک گھنٹہ گذر گیا۔ اب ان ہنگامہ آرائیوں کے اختتام کا وقت آیا اور ایک گولا اہل تماشہ کے جگر کو ہلا دینے والا ایک سخت گرج کے ساتھ پھٹا۔ جس کے خوف سے فضل ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ میرے جسم سے لپٹ گئے۔ میں نے چاہا کہ فضل کو مخاطب کروں اور کچھ کہوں کہ ——— آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور سامنے اندھیرا سا آگیا۔ آنکھیں پھر بند کریں ایک لمحہ بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ اوپر کے برقی قمقمے منور ہو چکے تھے۔ اور نیچے انسانی حسن جگمگا رہا تھا۔ اول تو دنیائے حسن کی رعنائیاں اور پھر اس کی غضب کی خود آرائیاں جدید تہذیب

دیمن کے بہترین ملبوس اور پھر اس پر برق پاش زرکاریاں
دونگین و معطر ساری۔ ۔ ۔ "دل میرود ز دستم صاحبدلاں
خدارا" یہ تھی نمائش جس میں ابھی میں گم ہی تھا کہ کسی
کی نکہت گیسو نے ہشیار کیا۔ میں نے چونک کر اپنے سے
پیچھے ہوئے فضل کی طرف دیکھنے کے لئے گردن پھیری۔
تو دیکھتا کیا ہوں کہ گول کافوری باہوں پر ساری کا زرکار
پلو پڑا ہوا جلد کی تابانی سے مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش
کر رہا ہے۔ میرے شانہ کے ایک جانب کوٹ کی پشت
پر اس کا نصف چھپا ہوا چہرہ بادل میں غائب ہونیوالے
چاند کی طرح نظر آرہا تھا۔ اس کے سیاہ لمبے بال ہوا میں اڑ
اڑ کر میرے رخسار سے مس ہو ہو کر ایک سرسراہٹ سی پیدا
کر رہے تھے۔ اس کا سارا جسم میرے ایک پہلو کی جانب
تمام جسم سے مس کرتا ہوا مجھکو اس کے آغاز شباب کا راز دار
بنا رہا تھا۔ میں اپنی آنکھیں تو روشنی کی چکا چوند کے بعد
کھول چکا تھا مگر وہ اپنی آنکھیں ابھی تک میرے شانہ
سے بند کئے میرے پہلو سے لگی کھڑی تھی میں سوچ رہا تھا
کہ آخر کون مجھ سے لپٹ کر اس قدر بیباکانہ کھڑا ہو سکتا ہے۔
کہ اس نے میرے کاندھے سے سر اٹھایا اور اور آنکھیں
کھولیں۔ "جنت۔ ۔ ۔ م" غالباً ختم کہنا چاہتی تھی
کہ انفعال کی وجہ سے حروف منتشر ہو کر رہ گئے اور لب
ایک نیم شگفتہ کلی کی طرح کھل کر ساکن ہوگئے۔ اس نے
اپنے نرم و نازک ہاتھ کو ایک جھٹکے کے ساتھ میرے پہلو سے
جدا کیا جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہو۔ وہ ایک زمین کے
اندازہ میں پیچھے ہٹی پھر سر میں ایک ہلکی سی مغرورانہ کشش
کے ساتھ میرا سراپا جائزہ لینے لگی جو میرے لئے صبر و ضبط
کا امتحان تھا۔ مجھے صحیح طور پر پہچاننے کے بعد میری طرف
سے نظریں پھیر لیں اور دوسری جانب بجلیاں گرانے لگی
اس طرح چند لمحوں کے بعد اپنے گم شدہ خوش قسمت کو پالیا
جو میرے چند قدموں کے فاصلہ پر کھڑا تھا جس کا سوٹ
اگر بالکل نہیں تو قریب قریب میرے سوٹ کے ہم رنگ
کپڑے کا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لے لیا "تم کہاں تھیں؟" "میں تو یہیں تھی"۔ یہ دو جملے تھے
جو طرفین سے ادا ہوئے اور دونوں مجمع کی وسعت میں
غائب ہوگئے۔

میرے اوپر ابھی لطف و حیرت کی کیفیات طاری
تھیں کہ فضل نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا مخاطب بنایا اور
کہنے لگے "یہ کیا؟ یہ کون تھی؟" ___ قبل اس کے کہ میں کچھ
جواب دے سکتا کہنے لگے "تم شاید ایک دن خود بھی پٹو گے
اور اپنے ساتھ مجھکو بھی پٹواؤ گے"۔ میں نے کہا۔
"فضل صاحب خفا ہو۔ یہ تو میں خود حیرت میں ہوں کہ یہ کیا
طلسم تھا میں نے تو آپ کو اپنے پہلو میں جگہ دی تھی آخر یہ
ٹکٹ گھر والی فیروزی ساری کیسی؟" وہ کہنے لگے "جی ہاں
مجھکو جگہ دی تھی۔ اچھا! بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ یہاں سے
نکل چلیں ورنہ ڈر ہے کہ کہیں اس کے ساتھ والا آدمی
آپ کی اس جرأت رندانہ کی داد دینے کے لئے آتا نہ ہو"۔
چونکہ ہم لوگ بہت تھک بھی چکے تھے اس لئے

ایک اسٹرنٹ میں جو اسی نمائش گاہ میں کچھ فاصلہ پر تھا تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے ایک خاموشی کے ساتھ پہونچے ۔ یہاں چھوٹی چھوٹی میزیں ایک مربع حلقہ میں قرینے سے لگی ہوئی تھیں ۔ ان کے اوپر سفید میزپوش جن کے کناروں میں باریک ٹکی ہوئی بیلیں ہوا سے اڑ رہی تھیں ۔ ہر میز کے وسط میں ایک ایک گلدستہ رکھا تھا ۔ جن کے تازہ پھولوں سے ہوا بسی ہوئی تھی ۔ ہم لوگ یہاں آکر بیٹھ گئے اور ملازمین سے چیزوں کے لانے کی فرمائش کی ۔ چیزیں آئیں اور ہم لوگ خورد و نوش میں مشغول ہوگئے ۔ آتش بازی کا تماشہ ختم ہونے کے بعد تھکے ہوئے مجمع کا رخ اسٹرنٹ کی جانب ہوا اور لوگ جوق جوق آکر بیٹھنا شروع ہوئے ۔ یہاں تک کہ جگہیں قریب قریب تمام بھر گئیں ۔ مگر ابھی ہم لوگوں کی میز کی دو کرسیاں خالی تھیں اس لئے کہ یہ میز ایک کونہ میں دروازہ سے دور تھی ۔

ابھی ہم لوگوں کو آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ناگہاں ایک متلاطم نوعیتی وہی شوخ حسینہ تمام نازک ترین نسائی خصوصیات لئے ہوئے اسٹرنٹ کے اندر ایک ایسے انداز کے ساتھ داخل ہوئی کہ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا کی ہر ہر چیز کو وہ اپنی ملکیت سمجھتی ہے ۔ خالی کرسیوں کا نظر سے جائزہ لیتے ہوئے ہم لوگوں کی طرف رخ کیا ۔ اس کے ساتھ وہ مرد بھی تھا ۔ فضل نے دیکھ کر کہا " لو ۔ وہ فیروزی ساری والی آئی ۔ اب آپ بچئے گا میں جاتا ہوں " یہ سنکر میرا چہرہ زرد ہوگیا جسم میں جیسے خون باقی نہیں ۔ خوف کی یہ حالت تھی کہ وہاں سے بے تحاشا بھاگنے کو جی چاہتا تھا ۔ لیکن پھر میں نے حواس درست کئے اور دل میں کہا " ہرچہ بادا باد " ۔ اتنے میں لوگ قریب آپہونچے ۔ ہم لوگوں نے کھڑے ہوکر ان کا خیر مقدم کیا اور قریب والی کرسیوں کو درست کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہا ۔ اور پھر ہم سب ایک ساتھ بیٹھ گئے ۔ میں بیٹھا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ شاید اب اس حرکت پر جواب طلب ہونے والا ہو کہ فضل نے دریافت کیا کہ " آپ کا اسم مبارک "

" مجھکو پرکاش کہتے ہیں اور یہ میری چھوٹی بہن سندری ہے ۔ اور آپ کا اسم شریف " ؟

فضل صاحب نے کہا : " میرا نام فضل ہے ۔ اور آپ میرے دوست ـــــــ "

بات کاٹ کر سندری بول اٹھی ۔ " مسٹر آفاق ہیں " ۔ میں نے فوراً ہی کہا ۔ " جی نہیں ۔ ماسٹر آفاق " ۔ اس جملہ پر وہ نہ رک سکنے والے زریں قہقہہ کے ساتھ ہنس پڑی ۔ جس کی ہمنوائی ہم لوگوں نے بھی کی ۔ غرض اس طریقہ سے ہم لوگ آپس میں ایک دوسرے سے شناسا ہوگئے ۔ اب میرا خوف بالکل دور ہوچکا تھا ۔ اور اس صحبت سے لطف اندوز ہونے لگا تھا ۔ وہ لڑکی میرے ہی مقابل والی کرسی پر جلوہ فگن تھی ۔ میں اسکو دیکھا کیا جبکہ وہ دیر تک چھوٹے چھوٹے رنگین بلبلوں کو جو لیمونیڈ کی

۱؎ فیروز تباہی شدہ زمرد کا ۔

کی وجہ سے پیدا ہو ہو کر گلاس کی تہہ سے پانی کی سطح تک آآ کر فنا ہو رہے تھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا بھولا بھالا کتابی چہرہ اور اس کی روشن و تاباں جلد جیسے فانوس کے اندر شمع روشن ہو۔ اس کی جلد کی صباحت و تازگی جیسے گلاب کی نرم و نازک پنکھڑی اس کی بڑی بڑی سیاہ کیف پاش آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک موجود تھی۔

وہ کیف پاش کسی کی نظر معاذ اللہ
ہنوز کیف کے عالم میں جھومتا ہوں میں

بوٹا سا قد جس میں لوچ ہی لوچ تھا اور پھر اس پر ہلاکت انگیز خود آرائی۔ فیروزی ریشمی ساری میں وہ کسی خواب پرور مصور کا نقش خیالی معلوم ہوتی تھی۔ میں شربت کا ایک گھونٹ پینے کے بعد پھر محو نظارہ ہو گیا۔ ساری کے تلے کا ملبوس کچھ ایسا دلفریب اور نظر افروز تھا کہ جس کی کاٹ چھانٹ و قطع سے نہ صرف اسکی صراحی دار گردن کا برہنہ رہنا ضروری تھا بلکہ اس کی بیرا تراش باہیں اور بلوریں شانے کے محو حصہ جسم کی برہنگی کا چشم بینا کیلئے دعوت نظارہ پیش کرنا لازمی تھا۔ میں غور کر رہا تھا کہ اس کے جسم کے گلابی رنگ سے اس کے ہار کے موتی کس درجہ ہمرنگ نظر آرہے ہیں جو ایک سنہری زنجیر میں منسلک اسکی ہنس کی سی گردن کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے۔ ان موتیوں کے درمیان ایک سبک رنگ فیروزہ بھی تھا جو بلوریں گردن کے ننھے گڑھے یا دگدگی میں اس طرح آسودہ تھا جیسے اسکی تخلیق کا منشا پورا ہو گیا ہو۔ انداز و ادا و دلربائی۔ بس ہر حیثیت سے ایک حقیقی عورت معلوم ہوتی تھی۔ یعنی اس میں نسائیت تھی بلکہ یوں کہئے کہ خود تکمیل نسائیت کا نمونہ تھی۔ یہ تھی فیروزی ساری جو اس مجسمۂ حسن و رعنائی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھی

یہ ہوشربا منظر قریب نصف گھنٹہ کے صبر آزما رہا۔ اسکے بعد وہ بکمال احتیاط اپنا حسین مرقع میرے ذہن کے نگارخانہ میں محفوظ کر کے خیرباد کہتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
مجھے ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں

از جناب جی، آر قیس شیخوپوری

گارڈ نے سیٹی بجائی۔ پھر انجن نے سیٹی دی۔ وہ
سافر جو ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے جلد جلد ریل پر سوار ہونے
لے۔ گاڑی پھک پھک کرتی ہوئی ہوڑہ پلیٹ فارم سے
روانہ ہوئی۔

میں نے اپنے برتھ پر بیٹھ کر اطمینان کی سانس لی۔
سگریٹ جلایا۔ کبھی کبھی دل کے اندرونی جذبات کے انتہائی
جوش و انبساط کی محویت میں ٹھیک اس طرح سگریٹ کا دھواں
اُڑاتا۔ جس طرح انجن سے دھواں نکل نکل کر اوپر کی طرف
اڑتا چلا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ فضائے آسمانی میں گم ہو جاتا ہے۔

گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ بجلی کی طرح بل
کھاتی ہوئی چل جا رہی تھی ——— میں نے اپنی نشست
کے پاس والی کھڑکی سے نگاہ باہر ڈالی دیکھا۔ گاڑی کھٹ
کھٹ کرتی اڑی جا رہی تھی انجن کا دھواں ساحرانہ انداز سے
آسمان کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا ہوا کھڑکی سے
چھن چھن کر آ رہی تھی باہر دور تک سرسبز و شاداب کھیت
بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے چھوٹے چھوٹے تالاب جن میں

کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے اُن کی بڑی بڑی گول
پنکھڑیاں زمردی تھال کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔
وسیع دریا خاموشی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اور خوبصورت
پرندے درختوں کی شاخوں پر روح پرور گیت گا رہے
تھے کیلے اور جنگلی درختوں کا گنجان جھنڈ ایک مہیب شکل
اختیار کئے ہوئے تھا۔ ہوا کے جھونکے سے درخت جھوم رہے
تھے اور زرد زرد پژمردہ پتیاں درختوں کی بلندی سے فضا
میں اڑ اڑ کر گرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دور سے فلک بوس
اور عالیشان عمارتوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے
ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے غرور و تکبر کے درمیان حقیقی
خوشی کھڑی مسکرا رہی ہے غرضکہ فضا میں ایک عجیب مستی
چھائی ہوئی تھی ہر چہار طرف زندگی اور مسرت کا ایک طوفان
بپا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ بہار کی تمام رنگینیاں اور رعنائیاں
اپنی آنکھوں میں جذب کر لوں میرے دل کے دریا میں مسرت
کی لہریں ۔۔۔ کر آ رہی تھیں۔
گاڑی ایک پل پر سے گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ

گذر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد رفتہ رفتہ رفتار مدہم ہونے لگی۔ گاڑی بردوان جنکشن میں رک گئی۔ مسافروں کے شور وغل گنواروں کی بے ہنگم دوڑ، اور بھیڑ بھاڑ سے اسٹیشن کثیر مجمع کے ساتھ متحرک نظر آنے لگا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک حسین نوجوان ــــــ دبلا پتلا خستہ حال پریشان بال، جس کا چہرہ نڈھال اور آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں ایک لپٹا ہوا کاغذ لئے میرے ڈبے کی طرف بڑھا۔ اندر آیا۔ دروازہ کے پاس دونوں ہاتھ ٹیک کر سر جھکائے کچھ دیر تک کھڑا رہا پھر ایک کونے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ ان میں درد و الم کا ایک سمندر تھا جو متوجہ ہونے کے بعد آہستہ آہستہ خاموش ہو گیا تھا۔ وہ کچھ کھویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ عالم پریشانی میں کبھی کبھی ادھر اُدھر دیکھنا شروع کرتا گویا وہ کسی کی تلاش میں ہے۔

ان حرکات کی وجہ سے وہ تقریباً تمام ہمسفر کی نظروں کا مرکز بن گیا۔ اس کے مجنونانہ انداز کو دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور دل میں یہ کرید پیدا ہوئی۔ کہ اس نوجوان سے اس کے رنج و غم کا سبب دریافت کروں، لیکن اس خیال سے کہ شاید وہ بُرا مان جائے اور مداخلت پسند نہ کرے خاموش بیٹھا اس کے حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔

گاڑی چلنے لگی تھی اس کے ساتھ نوجوان کچھ گنگنانے لگا۔ گنگناتا گنگناتا از خود رفتہ ہو کر نہایت ہی غمناک سُر میں گانے لگا۔ وہ درد و الم کا گیت گا رہا تھا جس نے میرے دل کو بے چین کر دیا۔ اس کے دردناک گانے کی آواز ایسی معلوم ہوتی تھی گویا ــــ ستار یک رات میں درد سے بیقرار ہو کر کوئی کراہ رہا ہے میں سمجھ گیا کہ وہ ضرور زمانہ کا ستایا ہوا ہے۔ آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے چھیڑا

"کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے" ؟

اس نے کسی قدر ترش روئی سے جواب دیا "نہیں ــــ" اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ لیا۔

میں نے دوسرا سوال کیا "جناب! آپ کہاں کا سفر کر رہے ہیں"۔ ؟

اس نے میری طرف نظر اٹھائی اور نہایت دھیمی آواز میں شاعرانہ متانت لئے ہوئے کہا۔

"نہ پوچھو کہاں کا ہے قصد اور کیوں ہے
سکوں ڈھونڈھتا پھر رہا ہوں مسلسل
میں جہاں پہنچ جاؤں۔ میری وہی منزل ہوگی"

میں نے ہمدردی کے لہجہ میں کہا "جناب! اس قدر پریشان کیوں ہیں ــــــ ؟"

اس نے جواب آہستہ سے دیا۔ "کچھ بھی نہیں"

میں نے کہا "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے ورنہ یہ نازک حالت نہ ہوتی۔"

اس نے جواب دیا ــــــ "ہر آدمی کی زندگی فی نفسہ ایک فسانہ ہے"

میں نے کہا آخر آپ کی زندگی کا کو فسانہ ہے،
جس کو آپ چھپا رہے ہیں۔ آپ اپنے دردِ دل کی کیفیت
بیان کریں، شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔

ریل کے ہچکولوں کے سبب ہم دونوں جھوم رہے تھے،
اور ہوا کے تیز جھونکوں سے اس کے سر کے بکھرے ہوئے بال
اُس کے رخساروں پر اِدھر اُدھر بل کھا رہے تھے اُس نے
منہ پھیر کر لمبی سانس لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

اُس چشمِ نرگسی کا اثر کچھ نہ پوچھئے
ہے پوچھنے کی بات مگر کچھ نہ پوچھئے

میری داستان بہت طویل ہے ــــــ اور
دردناک بھی ہے تم اپنا جی کیوں پریشان کرتے ہو۔؟

میں کچھ دیر کے لئے اپنی ہستی کو فراموش کر بیٹھا
اور بت کی طرح خاموش ہو کر اس نوجوان کے قصہ کو
سننے لگا۔

"یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب مجھ پر شباب کی کیفیتیں
اور ولولے طاری تھے اتفاق سے ــــ کرشنا کی
نظر مجھ پر پڑی، وہ کچھ دیر تک کھڑی مجھے دیکھا کی، پھر آہستہ
آہستہ میرے سامنے آئی۔ اور تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی۔
ہرنی کی طرح نکل بھاگی۔ میں بت بنا کھڑا رہا۔ دوسرے
روز سے یہ اس کا معمول ہو گیا کہ جب موقعہ ملتا وہ
کسی نہ کسی حیلہ سے میری نگاہ کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔
اور مجھے شوق میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتی
شروع شروع میں میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اور
اُس سے الگ تھلگ رہا میں کسی قبیح جرم کا مرتکب نہیں
ہونا چاہتا تھا محض اسلئے کہ دنیا کیا کہے گی۔ ایک بیا
ہوئی عورت سے محبت! نہیں ــــ کبھی نہیں ایک بیا
ہوئی۔ عورت سے چھپ چھپ کر ملنا۔ کیونکر اچھا ہو سکتا
جبکہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ اور نہ اسے اپنا
بنا سکتا ہوں وہ میرا پیچھا کرتی رہی ــــــ
دل بہت چاہتا تھا کہ اس غارتگر دیوی سے دور رہوں
آہ! میری کمزوری، میری کم ہمتی، نے مجھے کہیں کا نہ ر
آخر کار ــــ دن رات کے پیہم نظاروں کا نتیجہ
وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی اس کے آستانِ ناز پر میر
جبینِ نیاز جھک گئی۔ اور اسکی بلوریں باہیں میرے گلے میں
حائل ہو گئیں اور پھر ــــــ میری حیات ــ
پرکیف لمحات اُس کی محبت بار دنیائے نشاط میں گم
میں اس سے محبت کرنے لگا ــــــ!

سیا دان سنگھٹ کے سامنے تالاب کے کنا
آدھی آدھی رات بیٹھ کر جب وہ مجھ سے پریم کی باتیں کر
کرتی اور مجھے حسن و عشق کی دلچسپ کہانیاں سنایا کر
تو وہ کتنی حسین معلوم ہوتی تھی میں کھو جاتا۔ گم ہو جا
وہ مجھے جھنجھوڑ دیتی۔ تم عجیب ہو؟ وہ روٹھ جاتی۔ میں
منالیتا۔ وہ بگڑ بیٹھتی میں پیار کر لیتا میں اسے اکثر کہا
کہ میری اچھی کرشنا! تم صبح کی دیوی، شام کی پری
جب تک میرے دل کے خون کی حرکت جاری رہے گی
تمہاری نرگسی آنکھوں کا جادو، پھول جیسے رخسار

رنگین، کلیوں کی طرح نازک لبوں کی لطافت نہیں بھول
سکتا۔

کرشنا ننھی ننھی کلیوں کے شگوفے توڑ توڑ کر ہار
بناتی۔ چومتی اور میرے گلے میں ڈال دیتی۔ میں مسکرا"!
اور کہتا۔ میری کرشنا ۔۔۔۔! اگر بس چلتا تو میں خود تمہارے
گلے کا ہار بن جاتا۔

وہ میری بڑی دلجوئی کرتی اور کہتی کہ میں تمہیں کسی
طرح اپنے دل سے نہیں بھلا سکتی تمہاری دلکش و دلفریب
صورت نے میرے دل کی ملکیت پر اچھی طرح قبضہ کر لیا
ہے تمہارے بغیر میری زندگی حرام ہے کرشنا کے اس رنگین
فقرہ پر میں نازاں ہوتا اور پھولا نہ سماتا کیونکہ میں کرشنا
کی باتوں میں بڑا سکون پاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میری محبت
بہت زیادہ بڑھ گئی ۔۔۔! میں بری طرح تباہ ہو گیا
۔۔۔۔! میں کہیں کا بھی نہیں رہا۔

میری گرویدگی بہت بڑھ چکی تھی اور لوگوں سے
چھپی نہ رہ سکی۔ اس کے شوہر کو ہمارے اندرونی جذبات
کا اندازہ ہو چکا تھا محلے کی عورتوں میں چہ میگوئیاں
ہونے لگیں۔ میرے ماں باپ کو بھی معلوم ہو گیا ۔۔۔!
گھر پوچھ گچھ ہوا۔ ہر طرف سے لعنت پھٹکار کی بوچھار۔
میں نے بہت بڑا سنگین گناہ کیا۔ ایسا گناہ جو کسی
[illegible] نہیں لیکن جوانی دیوانی مشہور ہے میں جوانی
[illegible] میں جو اس کر بیٹھا۔ دین و دنیا کو بھول گیا نتیجہ یہ
[illegible] کرشنا کے شوہر نے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا۔

کرشنا بھی یہی چاہتی تھی، کیونکہ اس کا شوہر ساٹھ
سال کا بڈھا تھا۔ علاوہ اس کے پلے درجہ کا شرابی تھا۔
اس بڑھاپے پر بھی اپنے عیش و عشرت کی خاطر بازاری
عورتوں پر جان دیتا تھا۔

کرشنا مظفر نگر اپنے چچا کے گھر چلی گئی۔ اور یہ حسن
کا مجسمہ مجھ سے چھین لیا گیا۔ اس وقت میرے لئے دنیا
میں ہر طرف اندھیرا تھا۔ گھر مجھے کاٹے کھاتا تھا۔ وہاں رہنا
میرے لئے وبال جان ہو گیا۔ مجھے ہر چیز میں کرشنا ہی کرشنا
نظر آتی تھی۔ گھر چھوڑ دیا۔ اور کلکتہ آ کر ملازمت کر لی لیکن
وہاں بھی میرا جی نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت کرشنا اور اس کی
یاد ستاتی رہتی۔

کرشنا مظفر نگر پہونچکر مجھے خطوں کے ذریعہ برابر یاد
کیا کرتی۔ میں بھی اپنے دل کے زخموں کا حال لکھا کرتا۔ وہ جی
کھول کر خط لکھتی! اپنے درد دل کا بے خوف و خطر اظہار کرتی
کیونکہ اسے ہر طرح کا اطمینان تھا مجھے اسکے خطوں سے بہت
تسلی ہوتی میرے دل کی کلی کھل جاتی۔ اسی سلسلہ میں ایک
دفعہ کرشنا کا خط ملا جسمیں لکھا تھا۔

پیارے !

میری ہر تمنا کی آسمان نے مخالفت کی۔ میری ہر
امید کو زمانے توڑ دیا مجھ سیاہ بخت سے بڑھ کر
زمین کے خوبصورت چہرہ پر کوئی بدنما داغ نہیں۔
اپنی بپتا کہاں تک لکھوں جدائی کے صدمے اب
سہے نہیں جاتے تم سے ملنے کی بڑی آرزو ہے میرا

حال اس قدر متغیر ہو گیا ہے کہ شاید تم آجاؤ تو پہچاننا دشوار ہو جائے۔ اے کاش تم چند گھنٹے کے لئے آجاتے تو میں گویا پھر زندہ ہو جاتی اب میری اور کوئی تمنا نہیں کوئی آرزو نہیں بجز اسکے کہ ایک دفعہ تمہاری دلفریب صورت دیکھ لوں اور پھر اس دھرتی کی گود کو خالی کر دوں تمہیں اپنے سر کی قسم دیتی ہوں کہ میرا حال سنکر ہرگز رنج نہ کرنا۔ ہاں جہاں تک ہو جلد آنے کی کوشش کرنا۔ ایک ایک لمحہ میرے لئے سو سو برس ہے۔

تمہاری غم نصیب کرشنا!

خط پڑھ کر میرے زخم ہرے ہو گئے۔ اسی روز شام کی ٹرین سے مظفر نگر روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچکر دیکھا کہ کرشنا کی حسین آنکھیں کثرت گریہ سے دھندلی ہو گئیں ہیں اس کے نرم اور کنول سے رخسار غم سے کمہلا گئے ہیں اسکی بیوہ نما صورت دیکھکر مجھے بڑا رنج ہوا۔ اس کے سیاہ بل کھائے ہوئے لمبے بالوں میں وہ دیوانہ کر دینے والی دلفریب خوشبو نہ تھی بلکہ کرشنا کرشنا —— نہ تھی وہ بہت دیر تک میرے حلقہ آغوش میں بے بسی کے ساتھ پڑی سسکیاں لیتی رہی اس کے آنسوؤں سے میرا دامن تر ہو گیا میں نے تسلی دی —— دلجوئی کی، سمجھاتا رہا۔ اس کے بعد سینہ پر جدائی کا پتھر رکھکر بہت جلد کلکتہ واپس ہو جانا پڑا۔

(۱۱)

چند دنوں تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا لیکن افسوس کچھ عرصہ بعد اس سے محروم ہو جانا پڑا ایکایک خط و کتابت بند ہو گئی! اور نہ کوئی خبر ملی .... کہ وہ کہاں ہے و کس حال میں ہے؟ اور اس پر کیا گذرتی ہے؟ میں نے اس کو پے در پے کئی خطوط لکھے کہ یہ بے رخی کیسی۔ یہ بے اعتنائی کس جرم کی سزا ہے؟ میں تمہیں جان سے بڑھ کر چاہتا ہوں۔ دن رات تمہاری تصویر میرے دل میں اور میری آنکھوں کے روبرو رہتی ہے صبح و شام تمہارے تصور میں رہتا ہوں خدا کے لئے اب میرا کلیجہ ٹھنڈا کرو ورنہ یہ آگ مجھے جلا کر خاک کر دیگی۔ مگر وہ —— جواب نہ ملا میں پاگل سے بدتر ہونے لگا۔ ہر وقت بس میں تھا اور کرشنا کی یاد میں ویرانہ پسند ہو گیا۔ آبادی سے دور جا کر خوب روتا اور رو رو کر اسی طرح دل کا بخار نکالتا۔ بھائی —— میں نے کرشنا کے لئے کیا نہیں کیا مندروں میں دعائیں مانگیں۔ رشیوں منیوں کے پاس جا کر منتیں کیں۔ کیونکہ مجھے اسکی روح سے تعلق تھا۔ مجھ سے دور ہو یا قریب لیکن اسکی محبت میرے دل سے کبھی نہ نکل سکتی اور نہ کم ہو سکتی تھی۔

خدا گواہ ہے اور ایمان شاہد ہے کہ کرشنا کی روح پاک اور ہیرہ کی طرح شفاف تھی۔ اس کی عادتیں کیسی سادہ تھیں اس کا دل کتنا صاف تھا وہ کیسی بھولی بھالی تھی وہ دنیا اور دنیا کی پیچیدگیوں سے بے خبر تھی [illegible]

دوست نے دل کو توڑ کر نقش وفا مٹا دیا
سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اسی نے ڈھا دیا

میرے بھائی! اب زیادہ کچھ نہ پوچھو، اور داستان الم
نہ سنو۔ کلیجہ میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے جی چاہتا ہے کہ اس
چلتی گاڑی سے کود پڑوں کہ اس زندگی سے نجات ملجائے
نوجوان کے ہونٹ تھرانے لگے۔ اور وہ رک گیا
تھوڑی دیر کے بعد نوجوان نے پھر رو کر کہا ——— کرشنا
نے مجھے ٹھکرا دیا اور ایک دولت مند کے محل کی زینت بن
گئی۔ یہ خبر سنتے ہی میرے دل پر بجلی گر پڑی۔ دل کا ایک
ایک تار ٹوٹ گیا۔ جی مسوس کر رہ گیا۔ اور میری آنکھوں
سے آنسو بہنے لگے۔ سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے
اندھیرا چھا گیا۔ میری حالت اس وقت ناگفتہ بہ تھی
میں بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ آنکھوں کی روشنی معدوم ہو چکی ہے اور قریب ہے
کہ دم اکھڑ جائے بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپکو سنبھالا
افسوس قصر مسرت جس کو فولاد کا قلعہ سمجھتا تھا اس
صدمے کے بھونچال سے گر کر پاش پاش ہو گیا۔ شمع مسرت
گل ہو گئی۔ چراغ امید بجھ گیا۔ کرشنا میری جنت میری
جنت میری دنیا ——— میری تمام امیدیں کرشنا
سے وابستہ تھیں تصور میں اسکی پوجا کرتا تھا اس کے
[illegible] جب آنکھیں کھلیں کہ کرشنا میری
[illegible] اور عار [illegible] تو مجھے زندگی
[illegible] معلوم [illegible] دل [illegible] چاہا۔ کہ

خودکشی کر لوں۔ کیونکہ میری دنیا ویران ہو چکی تھی۔ میرا خزانہ
لٹ چکا تھا میری روح مجروح ہو چکی تھی میرا قلب پاش
پاش تھا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ دماغ الجھن میں
تھا سخت الجھن میں عقل کچھ کام نہ کر سکی، پلنگ سے اٹھا
لیکن قوت نہ تھی۔ نفرت اور غصے کی بھٹی سلگ رہی تھی۔
میں خدا سے فریاد کرنے لگا۔ اے مالک ——— ! اس بے
مروت ہستی کو جسے غلطی سے راحت روح سمجھا تھا برباد کر دے
تو دنیا پاک ہو جائے مجھے انتقام کی توفیق دے۔ دنیا میں کوئی
سزا اس کے جرم کا کفارہ نہیں ہے مجھے حوصلہ دے ہمت دے
کہ میں زندہ رہوں اور زندہ رہکر کرشنا سے انتقام لوں
ریاکاری کا جواب ریاکاری سے دوں۔ اور اس کو جتا دوں
کہ بدبخت عورت! پہلے تو نے مجھے لبھایا۔ مجھ پر محبت کا جال
ڈالا اور مدتوں ایک رنگین دھوکے میں پھنسائے رکھا۔
پھر میری آنکھوں کے سامنے غیر کے پہلو میں ———
بدبخت تجھے شرم نہ آئی۔ کیا میری پاک محبت کا یہی دلخراش
جواب تھا ——— آہ ——— ! تو نے میری زندگی داغدار
کر دی لیکن یاد رکھ تو بھی زندگی کی بہار لوٹ نہیں سکتی
لیکن مجھ سے بیوفائی ممکن نہ تھی میرے دل نے اسے
قبول نہ کیا۔ محض اسلئے کہ یہ بھی ایک فریب ہے اس کے
بوسوں سے زیادہ بے معنی فریب ——— !
جب میری وحشت روز بروز بڑھنے لگی! اور لوگ دیوانہ
سمجھنے لگے۔ میرے والدین نے چاہا کہ میں شادی کر لوں اور
اپنی حالت سدھاروں میں نے صاف انکار کر دیا۔ معلوم

کیوں ــــــ؟ مجھے ہر عورت مجسمہ دھوکہ اور فریب کا پتلا معلوم ہونے لگی۔ کبھی یہ بھی دل میں آیا کہ اس قسم کی ایک ایک عورت کو چن چن کر ....

.... کاش مجھے چند لمحوں کے لئے ہندوستان کی حکومت مل جاتی اور میں حکمراں ہو جاتا تو ان عورتوں کو جو خوبصورت سانپ سے کم نہیں۔ خونخوار درندوں اور بھیڑیوں سے بری طرح نچوا کر ان کے گوشت پوست کو چیل کوؤں کی نذر کر دیتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورتیں فریب نہیں دیتی بلکہ مرد انہیں فریب میں مبتلا رکھتے ہیں وہ بہت معصوم اور پاک ہوتی ہیں۔ ان کا دل صاف ہوتا ہے۔ اسی لئے عورتیں صنفِ لطیف کہلاتی ہیں۔

مجھے ہنسی آتی ہے اور تعجب بھی ہوتا ہے کہ یہ وہی صنف ہے جس نے دنیا کو دھوکہ دیا۔ دور کی جانے دو میں تو آپ بیتی کہہ رہا ہوں۔ مجھے خود پورا تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ عورتوں پر اعتبار کرنا حماقت ہے اس کا جسم اسکی روح ہر وقت گناہ میں ڈوبی رہتی ہے اسکی روح میں پارسائی نہیں ہوتی ہے

گاڑی فرائٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ نوجوان بھی اپنی پر الم داستان سنائے جا رہا تھا۔ اب اسے ایک داستان سمجھو زمانہ گذر گیا۔ اور زندگی کا وہ دلچسپ مگر بہت پر اسرار کھیل ختم ہو چکا ہے

اگلے سال جب میں پوجا کی تعطیل میں مکان پہونچا۔ تو خلافِ معمول اس روز اپنے گھر میں بہت سی عورتوں کا ہجوم دیکھا پوچھا ــــــ ماتاجی یہ شور و غل کیسا ہے کہنے لگیں بیٹا! آج تمہارا بیاہ ہے، یہ سنتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے جی سن سے ہو گیا کیونکہ میں کسی عورت سے محبت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ماتاجی سے کہہ دیا کہ میں بیاہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ معلوم نہیں کہ میری بیوی کیسی ہو؟ مدت ہوئی بچپن میں اسے دیکھا تھا۔ یہ کس قدر ستم ہے کہ دو شخصوں کی زندگی عمر بھر کے لئے یوں باندھ دی جاتی ہے چچا صاحب مجھے فوراً باہر لے گئے اور سمجھانے لگے دیکھو ــــ انکار نہ کرنا۔ گھر میں سارے مہمان جمع ہیں۔ کوئی سن لیگا۔ تو کیا کہے گا؟ آہستہ سے کام لو۔ عزت پر دھبہ نہ لگاؤ۔ تم میری بات نہیں مانوگے۔ تو عمر بھر نہ کسی کو منہ دکھاؤں گا۔ اور نہ تمہارا منہ دیکھونگا۔ آخرکار ــــــ میرا بیاہ دلاری کے ساتھ ہو گیا۔

گذرے ہوئے افسانہ کا ماتم کب تک۔ کرشنا میری زندگی خراب کرنے کو کر گئی۔ لیکن کرشنا کے دل کا کنول شگفتہ نہ ہوا۔

کچھ عرصے کے بعد کرشنا کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اسے ہر طرح کا اطمینان تھا آرائش کی تمام چیزیں کافی تھیں۔ جب تک کرشنا کی چڑھتی جوانی تھی اس کا شوہر بدمست بھونرے کی طرح منڈلاتا رہا۔ اس کے بعد خبر ملی کہ اس نے اپنی ہوس پوری کر کے کرشنا کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ آہ ــــ! میں نے کرشنا کی محبت کو خون سے

پرورش کی تھی۔ مگر وہ میری محبت کی قدر نہ کر سکی۔ اُسے جھوٹے اور سچے ہیرے کی تمیز نہ تھی۔ تاریکی میں روشنی اور ویرانے میں آبادی ڈھونڈھنے گئی تھی۔ وہ سچے دل کی قدر نہ کر سکی۔ اور دھوکہ کھا گئی ——— وہ بلبل جس کی نوا سرائی سے چمن درحقیقت چمن کہلاتا تھا۔ اب خاموش ہے یعنی گرشنا دیکھنے میں زندہ لیکن مردہ سے بدتر ہے اسکی حالت اس ملاح کی طرح ہے جو کشتی ڈوب جانے کے بعد ساحل پر کھڑا نظر آتا ہے جب وہ دنیا کو رنگین اور سرسبز دیکھتی ہے تو اس کا دل مسوس اُٹھتا ہے مگر وہ رسوائی اور بدنامی کے خوف سے نہ روتی ہے نہ چلاتی ہے نہ گلہ کرتی ہے نہ حرف شکایت زبان پر لاتی ہے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتی ہے لیکن نہیں روتی کہ دیکھنے والوں میں چرچا نہ ہو۔ وہ خود سمجھتی ہے کہ میرے اختر تقدیر میں کیسی آگ لگی۔

چاند نمودار ہو چکا تھا اس کی منور کرنیں خاموش فضا میں رقص کر رہی تھیں۔ باد نسیم کے ہلکے ہلکے خوشگوار جھونکے لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اور انجن سے دھواں نکل نکل کر ہر چہار طرف پھیل رہا تھا گاڑی اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔

نوجوان کچھ دیر مبہوت رہا۔

وہ دیکھتا رہا ——— میں پر ٹکٹکی لگائے یہ سوچ رہا تھا کیسی بھولے ہوئے افسانہ کو۔ ماضی کے کسی لمحہ کو افسانہ حیات کے کسی ٹکڑے کو۔ لیکن یاد نہ آتا تھا۔ وہ سر جھکائے پہروں بیٹھا رہا۔

میری آنکھیں نوجوان کے چہرہ پر گڑی تھیں اور اُس کی آپ بیتی کہانی سن رہا تھا۔

نوجوان کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آنکھیں سرخ سرخ اور لال بھبوکا ہو گئیں۔ گہری گہری سانس نکلنے لگی۔ پھر ایک وحشیانہ قہقہہ لگا کر کہا۔

میں نے شراب پی۔ اُف کتنا بڑا پاپ۔ کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ معاف نہیں ہوگا۔ خدارا تم مجھے شرابی نہ سمجھنا۔ میں شرابی نہیں ہوں۔ میں نے شراب اسلئے پی کہ اُس کی یاد۔ اُس کا خیال دل سے نکل جائے۔ اور اس کا تصور بھولے سے نہ آئے۔ مگر آہ! ایسا نہیں ہوا۔ کیونکر ہو سکتا ہے؟

تمہیں تعجب ہوگا لیکن تعجب نہیں کرنا چاہیئے عورت ہر ممکن طریقہ سے مرد کو تباہ کر سکتی ہے اور مرد آسانی سے تباہ ہو سکتا ہے۔

نوجوان کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ نظریں نیچے جھک گئیں۔ اس نے لپٹے ہوئے کاغذ سے ایک تصویر نکالی اور مجھے دکھاتے ہوئے کہا لو ——— اسے دیکھو یہ اُسی کی تصویر ہے۔ کتنی بھولی بھالی مگر ہے غارتگر ———

یہ وہی ہے۔ وہی نا ہنجار جس نے میری دنیا اُلٹ دی برباد کر دی اور میری مسرتوں کو لوٹ لیا۔ اُف ———!

یہ وہی جہنمی مخلوق ہے جس نے مجھے پاگل بنا دیا۔

میں پانی پینا چاہتا ہوں مجھے پانی پلا دو۔

آسمان پر جلوہ گر تھا۔ ہر چہار طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی اور گاڑی پوری رفتار سے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چھا چھا کے لق و دق میدان سے گذر رہی تھی۔ لیکن نوجوان استغراق کے عالم میں بے حس پڑا تھا

ہم نے نوجوان کے طلسم سکوت کو توڑ ڈالا۔ اُس نے کہا! آؤ ہم بغاوت کریں، اُن حوا کی بیٹیوں سے اور برباد کریں، اُن کے دلفریب حسن کو۔ آو —— جنگ کریں، اُن عورتوں سے اور تباہ کریں۔ اُن کے خوبصورت دھوکے اور رنگین فریب کو۔ تمہیں چپ سی کیوں لگ گئی ہے؟ تم چپ کیوں ہو؟ کیا تمہیں عورتوں سے ہمدردی ہے کیا عورتوں کو مقدس دیوی سمجھتے ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اٹھو جلدی کرو۔ آو —— بڑھو۔ ہم پھونک دیں اپنی آہ سے اُس کے نشیمن کو تاکہ مرے جلے ہوئے دل کی گرمی کچھ کم ہو جائے۔ دنیا پاک ہو جائیگی۔ دھوکے اور فریب نیست و نابود ہو جائیگا۔ پھر ہمیں امن اور شانتی اپنی گود میں جھولا جھولائیگی۔

نوجوان کے مجذوبانہ فقرے ہوا سے ٹکرا ٹکرا کر باہر نکل رہے تھے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا زمانہ گذرتا گیا۔ میری کہانی روز بروز فرسودہ اور پرانی ہوتی گئی لیکن یہ غم —— یہ تڑپا دینے والی مصیبت اور اُس کا سنگین جرم میرے دل سے بھلایا نہ گیا۔ اور نہ حافظہ سے نکل سکا۔ اسی طرح چند سال گذر گئے میں نہ جانے کیں طرح اسی سیاہ دان پنگھٹ کے نزدیک جہاں محبت کا بیج بویا گیا تھا۔ جہاں عہد و پیماں کا مستحکم رشتہ جوڑا گیا تھا۔ گذر رہا تھا کہ ایک مہین سی آواز سنائی دی۔ جیسے کسی نے میرا نام لیا ہو۔ یہ آواز کسی غیر کی نہ تھی۔ بلکہ اسی غارتگر کی آواز تھی اُف —— میں کیوں ٹھہر گیا۔ اُسکی بڑی بڑی جادو بھری آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ پشیماں تھی میں مضطرب ہو گیا۔ میرے دل میں ٹیس اٹھنے لگی، ایک جہنمی عذاب اور سوہان روح معلوم ہو رہا تھا۔ محبت اور عداوت میں جنگ ہونے لگی۔ وہ میرے پاؤں پر گر پڑی بے اختیار ہو گئی۔ وہ رونے لگی۔ ہچکیوں کے ساتھ۔ میں نے بھاگنا چاہا۔ لیکن اس نے مجھے نہیں چھوڑا۔ معاف کر دو معاف کر دو۔ میں شرمندہ ہوں۔ گنہگار ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ بڑی ہی بے مہری برتی۔ میں تمہاری اب بھی پرستش کرتی ہوں تمہاری محبت میرے دل میں اسی طرح جذب ہے جسطرح چاند میں روشنی۔ خدارا میری فریاد سن لو۔ تمہارے بغیر لطف زندگی نہیں۔ مجھے معاف کر دو معاف کر دو پیارے معاف کر دو ——!! کیا تم معاف نہیں کر سکتے؟ اگر تم نے معاف نہیں کیا تو محبت کا گھن میرے جسم کو کھا جائے گا

آہ —— گنہگار عورت کے آنسوؤں سے میرا پاؤں تر ہو رہا تھا۔ میں نے زور سے دھکا دیکر جھٹک دیا وہ منہ کے بل گر پڑی۔ اس کا جسم لہولہان ہو گیا۔ میں نے کچھ پرواہ نہ کی مجھے ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اور صاف کہدیا۔

تمہاری عزت اور محبت غارت ہو۔ تم اپنے جذبات کو آگ لگا دو۔ پھر میں وہاں سے فرار ہوگیا۔

کلی کھل کر پھول بنتی ہے لیکن پھول کھل کر کلی نہیں بن سکتا۔ معصوم گنہگار ہو سکتا ہے لیکن گنہگار معصوم نہیں ہو سکتا۔ ہم محبت کے لئے مرتے ہیں۔ اور مر کر فنا ہو جائیں گے۔ تاکہ ہماری سچی محبت سے تمام محبت کرنے والوں کی روحیں مسرور ہوں۔

نوجوان کی آواز رفتہ رفتہ سست ہونے لگی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے منہ سے ایک دلخراش آہ نکلی۔ اس نے پھر نہایت غمناک اور کسل انگیز کروٹ لیتے ہوئے کہا

اُف میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ میرا جسم پھنک رہا ہے وہ کراہنے لگا۔ میں نے اس سے سو جانے کی درخواست کی۔ اب کچھ آرام کرو۔ تھکاوٹ اور پریشانی دور ہو جائے گی۔ سر کا درد اچھا ہو جائیگا۔ نوجوان دراز ہوگیا ——— دراز ہوتے ہی اس پر ایک مکمل سکون طاری ہوگیا۔ میں بھی قریب ہی بستر پر لیٹ رہا۔

کھڑکی سے ہوا چھن چھن کر آ رہی تھی۔ ہوا نے مجھے تھپک کر سلا دیا۔ پھر مجھے دین و دنیا کی خبر نہ رہی میں کب تک سوتا رہا۔ مجھے علم نہیں۔

کیول جنکشن میں جب قلیوں کی چیخ پکار نے میری آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈبہ لوگوں سے بھرا ہے اور میرا نوجوان ساتھی غائب۔ مجھے سخت تشویش ہوئی۔ سامان جلد جلد درست کرنے لگا۔ میں اتر گیا۔ اس کے بعد میں نے نوجوان کی تلاش میں اپنے دائرہ تجسس کو وسیع کیا اور ہر چہار طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ رات کا بہت بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا۔ چاند بھی چھپ رہا تھا۔ مگر آہ نوجوان کہیں نظر نہ آیا۔

شرابی

از جناب سہیل عظیم آبادی

جب اس کی آنکھ کھلی۔ تو سورج اونچا اٹھ چکا
تھا۔ اور اس کی تیز کرنیں اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں،
اُس نے اٹھتے ہی چاروں طرف نظر پھرا کر دیکھا۔ ہر طرف
سناٹا تھا۔ اس نے سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کیا۔
ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہی اس کا ہاتھ پسینے سے بھیگ گیا
تھکن سے اس کا سارا بدن چور اور ٹوٹتا ہوا معلوم ہو رہا
تھا۔ ماتھے کو دو چار بار دبانے کے بعد اس نے ایک لمبی
جمائی لی اور کوشش کر کے سارے جسم کو زور دیکر کھینچا اٹھنے
کی کوشش کی لیکن جی نہ چاہا وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل اور گلاس کے ٹکڑے
اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے اُن پر اس کی نظر جم گئی۔ وہ
بالکل خالی دماغ تھا۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔
——— رات کے واقعہ پر وہ غور کرنے لگا۔ رات کتنی
پیاری تھی چاندنی رات تھی۔ کبھی کبھی بادل کے ٹکڑے
چاند کو چھپا لیتے تھے۔ ہوا تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔
وہ اپنے چمن میں بیٹھا تھا چمن کی یاد آتے ہی اس کو کچھ تکلیف
سی ہوئی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اس کے خیالات غائب
ہو گئے ——— مگر پھر اس کو خیال آیا ——— ایسے وقت میں
طبیعت چاہی کچھ پینا چاہئے۔

یہ خیال آتے ہی وہ سوچنے لگا۔ اس چمن نے کہیں
کا نہیں رکھا چار مکان، زمینداری اور کل نقدی — اب
کچھ نہیں — اس کو اپنے کئے پر افسوس آنے لگا......
وہ بری طرح پچھتانے لگا۔ آخر اُس نے شراب پی کیوں تھی
اس کمبخت کو منہ ہی کیوں لگایا تھا — برا ہو اُن دوستوں کا
جنھوں نے اس کی چاٹ دلائی۔ اب کوئی کمبخت آتا بھی نہیں
——— میں اب بھی وہی ہوں، میرا مکان وہی ہے میرا چمن
وہی ہے۔ ہاں پہلے جیسا ہرا بھرا نہیں۔

اُس کے دل پر ایک دھکا لگا ——— آہ کتنا
خوبصورت چمن تھا لوگ دیکھکر تعریفیں کرتے تھے وہ اسی
چمن میں بیٹھا تھا۔ دوست احباب بیٹھے تھے۔ اور پینے
کی بات چھڑی — اور یہ لعنت سر پر بھوت بنکر سوار ہو گئی
اُس نے یکایک محسوس کیا۔ اُس کے پسلی میں کچھ
درد سا ہو رہا ہے قمیص اٹھا کر ٹٹول کر دیکھا۔ پسلی پر نیلا نشان
اور ابھار تھا۔ اور درد بھی۔ یاد آگیا اُس کو لوگوں نے
مارا بھی ہے تھوڑی دیر تک وہ اپنے کئے پر پچھتاتا ما رہا —
سوچنے لگا۔ اگر شراب نہ پیتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ اف اس

حال میں نہ ہوتا۔

مگر اس کا خیال بھٹک کر ایک ہوٹل میں پہنچا جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جاکر شراب پیا کرتا تھا۔ صاف صاف کپڑے پہنے بیرے، چمکتی ہوئی بوتلیں، جھلکتے ہوئے گلاس بیروں کا ادب۔ سگریٹ کی سنہری ڈبیہ ـــ ساری چیزیں یاد آئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے خود کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگا۔ اپنی موجودہ حالت کو بھول گیا ـــ پھر باتیں یاد آئیں ـــ اپنے عالیشان بنگلے میں دوستوں کی دعوتیں ـــ پیلی پیلی چمکتی ہوئی بوتلیں۔ دوستوں کے قہقہے دلچسپیاں ـــ پھر چمپا سے ملاقات اور ساری دلچسپیاں۔

چمپا کی یاد نے اس کو تھوڑی دیر کے لئے بےچین کر دیا۔ لیکن اس کی بے رخی اس کو یاد آگئی۔ وہ روٹھ کر چلی گئی تھی اس کی فرمائش تھی ایک ہار کی وہ پورا نہ کر سکا تھا۔ حالانکہ ہزاروں روپے لے چکی تھی۔ مگر اس نے آنکھ بدل دی۔ ایک ہی بار میں۔

چمپا کی بے رخی کے ساتھ ہی اس کو اپنی بیوی کی یاد آگئی جس کو اس نے خوب خوب ستایا اور رلایا تھا۔ مگر پھر بھی جب پیسے ختم ہو گئے۔ تو اس نے اپنا سارا گہنا بھی اس کے حوالے کر دیا۔ اس کو اپنی زیادتیاں یاد آئیں، وہ دل دکھنے لگا۔ اگر اب وہ موجود ہوتی تو گڑگڑا کر اس سے معافی مانگ لیتا۔ لیکن وہ مر چکی تھی ـــ یہ خیال آتے ہی اس کو اور بھی افسوس ہوا۔ آہ میں نے اس کے نام پر ایک صدقہ خیرات بھی نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

بیوی کی موت کے خیال نے اس کو اپنی موت کی یاد دلادی۔ وہ سوچنے لگا مجھے بھی ایک دن مرنا ہے۔ آہ کتنے گناہ میں نے کئے ہیں۔ نہ دین کا رہا اور نہ دنیا کا۔ دونوں گنوا بیٹھا۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مرنا تو ایک دن ہوگا ہی! آہ کبھی ایک وقت نماز بھی تو نہیں پڑھی ـــ اور یہ سب کچھ شراب کی وجہ سے ہوا ـــ

شراب کی یاد آتے ہی پھر دوسری باتیں یاد آنے لگیں، برانڈی، وہسکی، شامپین ـــ پھر پیرپلٹ ـــ پھر پیسوں کی کمی نے دیسی شراب پلائی ـــ بھٹی کی بدبو، گندے لوگوں کی فضول بکواس۔ ذلیل قسم کے گانے ـــ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

اس کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اپنے کاموں پر کڑھنے لگا۔ اس کا دل دکھنے لگا۔ آنکھ میں آنسو بھر آئے "اس کمبخت شراب نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا" اس نے دل ہی میں کہا۔ اور رونے لگا۔ دیر تک روتا رہا سارا چہرہ آنسو اور پسینے سے تر ہوگیا۔ رات کو کچھ دوستوں کے ساتھ بھٹی سے آیا تھا ان لوگوں نے باتوں باتوں میں خفا ہو کر مارپیٹ کی ـــ ان لوگوں نے جن کے روئیں روئیں پر میرے احسانات ہیں۔ آہ یہ سب کچھ میری ناسمجھی سے ہوا لیکن اب مجھے سنبھل جانا چاہئے۔

اس نے یہ فیصلہ کیا۔ اب کبھی شراب نہ پئے گا ـــ نماز پڑھے گا۔ شریف آدمیوں کی سی زندگی گزارے گا۔ وہ سجدے میں گر پڑا اور خوب رویا۔

دھوپ تیز ہوئی۔ گرم ہوا چلنے لگی تو وہ اٹھا۔ اور سر جھکائے گھر کی طرف چلا سناٹا میدان تھا ایک آدمی نظر نہ آیا۔ کہیں کہیں پر درخت تھے اور بس۔

وہ برابر چلتا رہا۔ نیک بننے کا وہ مضبوط فیصلہ کر چکا تھا۔ زبان پر برابر توبہ استغفار توبہ استغفار کا وردہ تھا

آخر وہ شہر میں پہنچا۔ ساری رونقیں تھیں۔ کہیں کچھ کمی نہ تھی۔ ایک دکان پہ گراموفون بج رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ریکارڈ بھی اچھا تھا۔ اس بھیڑ میں وہ بھی جا ملا۔ سب کے ساتھ سنتا رہا۔

گراموفون بجنا بند ہوا تو وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں گاڑی گھوڑے۔ موٹر۔ سائیکل اور ساری سواریاں ملیں۔ ہٹو بچو کے ہنگامے نے ساری باتیں اس کے دماغ سے نکال دیں۔ صرف بچنے کا خیال اس کے دماغ میں رہ گیا۔

وہ کچھ دور اور بڑھا۔ دور سے دیسی شراب کی بو ناک میں آئی۔ لیکن وہ سر جھکائے بڑھتا گیا۔ دل چاہا کہ اس طرف چلے۔ لیکن وہ چند قدم اور آگے بڑھا۔ لیکن دل کر بھٹی کی طرف چلا۔ خیال ہوا۔ سنگنے نہیں مگر تھا کمبخت نظر آجائے۔ وہ اسی طرف بڑھتا گیا۔ اور بھٹی سامنے پہنچا۔ بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ سب کو دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ گرمی معلوم ہوئی۔ خیال ہوا کہ چھاؤں میں تھوڑی دیر بیٹھنا چاہیے —— خیال بھٹی میں۔ لیکن پھر خیال بدل گیا۔ وہاں جانا ہی دیر تک سوچتا رہا۔ شراب کی بو برابر آ رہی دل چاہتا۔ لیکن وہ توبہ کر چکا تھا دل کڑا کئے کھڑا پاؤں جم کر رہ گئے۔ آگے نہ بڑھے —— آخر اس نے —— توبہ تو کر ہی لی ہے اور اس کمبخت کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ ہے —— لیکن آج پھر —— کل سے بالکل نہیں۔

یہ خیال آتے ہی وہ بھٹی میں گھسا کچھ پیسے ہی میں تھے۔ شراب خریدی۔ کلھڑ میں انڈیل کر ایک کلھڑ پیا۔ شراب حلق سے نیچے اتری اور وہ ساری باتوں کو بھو

از جناب رشید احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے علیگ، چیرمین شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(یہ تقریر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی)

پرانے زمانہ کا ایک شعر سنئے اور مجھے بخش دیجئے۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

مجھے یقین ہے کہ میں اپنے آپ کو پیر دانا قرار دیدوں تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس لئے کہ پیری کے ساتھ دانائی کا اضافہ کوئی مضائقہ کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے سنا ہوگا پیری و صد عیب!

لیکن مجھے یہ تامل ہو رہا ہے کہ آپ بھی جوانان سعادتمند کے زمرہ میں آتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ جہاں تک میرا تجربہ ہے کم سعادت مند جوان دیکھے گئے ہیں۔ اور کوئی جوان سعادت مند ہونا گوارا نہیں کرتا!

بہرحال۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے امید ہے کہ آپ سعادت مندی سے کام نہ لیں گے تو خواہ مخواہ جوانی کا مظاہرہ بھی نہ فرمائیں گے!

ہاں تو مجھے کہنا یہ تھا کہ اردو کی شاعری میں "ناصح" واعظ یا شیخ کے بھائی بند زاہد اور محتسب سے بڑی بدگمانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ انہیں میں سے کہیں بھیس بدلے ہوئے اور کہیں لاٹھی لئے ہوئے محتسب بھی نظر آجاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ناصح، واعظ، شیخ اور محتسب سے اردو شاعری میں بڑی بدگمانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ عشاق، شعراء، میخوار یا رند جس بات کو سب سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اسی کو ناصح یا واعظ سب سے برا سمجھتے ہیں۔ محتسب تو مار تک بیٹھتے ہیں۔ عاشق میخوار یا رند کو ناصح ہر طرح کا نیچ اور پنچ سمجھاتا ہے۔ کہتا ہے کہ تمہاری حرکتیں اخلاق، مذہب، بھلمنساہت، عافیت جوئی یا مصلحت اندیشی کے خلاف ہیں۔ ان سے باز آؤ، توبہ کرو، کان پکڑ کر اٹھو بیٹھو ورنہ آخرت میں جہنم کا ایندھن اور دنیا میں چکوسلوویکیا بن جاؤگے۔

عاشق کہتا ہے، کبھی ہنس کر کبھی رو کر بیشتر جھک جھک کر کہ یہی باتیں "حاصل حیات" ہیں۔ یہ نہ ہوں تو دنیا مافیہا سب ہیچ۔ یہی نہیں بلکہ عاشق سمجھتا ہے کہ یہ "محبوب، محبت، قلندری، بے نیازی اور بے باکی کی رمز، لطائف یا معاملے سے واعظ بے خبر ہے۔ اس لئے اس کی باتیں نا قابل اعتنا اور اس کی بدعقلی قابل درگذر ہے۔

وہ زاہد یا واعظ کو بدمذاق بھی سمجھتا ہے اور ناواقف احوال بھی۔ وہ کبھی یہ کہتا ہے کہ

رعنائی خیال کو ٹھیرا دیا گناہ
زاہد بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور

تو دوسری جگہ کس حزیں انداز سے یہ بھی کہہ گزرتا ہے ۔

یہ کیا تو نے کہا ناصح نہ جانا کوئے جاناں میں
ہمیں تو رہرووں کی ٹھوکریں کھانا مگر جانا

واعظ اور رند کی یہ چشمک وکشاکش بڑے زمانے سے چلی آتی ہے۔ واعظ مذہب' اخلاق یا سماج کی حمایت کرتا ہے اس مذہب' اخلاق وسماج کی نہیں جسے ہم آپ جب چاہیں زیر زبر کردیں بلکہ اس مذہب اخلاق یا سماج کی جو آئین وسنین اور فکروتشا کے خنتر سے نکلا اور جسے نسلوں نے نکھارا اور سنوارا ۔ وہ شریعت یا سوسائٹی کو مجموعی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے' فکروعمل کے اجتہاد یا شخصی آزادی کے خلاف ہوتا ہے۔

رند کہتا ہے اور اپنی جگہ پر ٹھیک کہتا ہے کہ شخصی فکرو عمل کی آزادی نہ ہو تو دنیا سے بڑھ کر مہمل جگہ کوئی نہیں شریعت واخلاق سے شیرازہ بندی ہوتی ہے' زندگی کے نئے ابواب کا افتتاح نہیں ہوتا۔ زندگی کا وظیفہ کائنات کی ورق گردانی ہو تو ہو۔ حیات انسانی کا مقصد مضمون آفرینی اور گرہ کشائی ہے جس کے بغیر انسان کی عظمتیں بے معنی' کائنات کی گتھیاں لاینحل اور وجود الٰہی بے اصل ۔

لیکن اس قسم کی بحث سے آپ کو کیا فائدہ ۔ یہ باتیں تو بڑے لکھوں کی شاخیں ہیں جن میں قاضی قاتل اور قاتل قاضی ہوتے ہیں۔ تاہم قتل و قضا سے علیحدہ ہو کر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ میری نیت بخیر ہے ۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ شعروشاعری سے پہلے ہی پہلے کچھ وعظ ونصیحت ہو جانی چاہئے اس لئے کہ شعروشاعری میں وعظ ونصیحت شامل ہو جاتی ہے تو لوگ بہت برہم ہوتے ہیں اور رہی دور کرنے کے لئے اکثر نصیحت سے کام لینا پڑتا ہے ۔ نصیحت کارگر نہ ہو تو البتہ کچھ اور کیا جاتا ہے جس کی ضرورت ہو تو ہو موقع نہیں ہے ۔ کیونکہ آپ دور ہیں اور میں معذور۔

نصیحت' کے اقسام ہیں۔ مقام بھی۔ بعض لوگ نصیحت تو کرتے ہیں لیکن اس کے لئے موقع اور مقام ایسا انتخاب کرتے ہیں کہ سننے والا بدحواس ہو جاتا ہے اور بدحواسی میں کچھ ایسی باتیں کر گزرتا ہے کہ ہم کو آپ سے اور آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لئے شکایت پیدا ہو جاتی ہے ۔ نصیحت کرنا میرے نزدیک بڑی قابلیت کا کام ہے اس لئے کہ نصیحت کرنے سے زیادہ معمولی اور آسان مشغلہ اور کوئی نہیں ہے ۔ اور ظاہر ہے معمولی اور آسان بات کو ایسا بنا دینا کہ وہ موثر اور دلنشیں بھی ہو جائے بہت مشکل کام ہے ۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نصیحت سننی چاہئے ۔ نصیحت کرنے والے کو نہیں دیکھنا چاہئے ۔ میں اس کا قائل نہیں میں تو نصیحت کرنے والے سے متاثر ہوتا ہوں نصیحت یا اصول نصیحت قسم کی چیزوں کا پاس نہیں رکھتا ۔ آدمی آدمی سے متاثر ہوتا ہے نصیحت سے نہیں۔

نصیحت کے باب میں ایک بزرگ نے بڑی اچھی بات بتائی ہے ۔ یعنی نصیحت کرنا بڑی بے وقوفی کی بات ہے ۔ اور اس سے بڑی بے وقوفی یہ ہے کہ نصیحت پر عمل

نہ کیا جائے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں نصیحت نہ سہی ناصح میں بڑے عیب چھپے ہوتے ہیں۔ نصیحت کر دینے کے بعد ناصح بعض دوسرے اہم فرائض سے اپنے آپ کو بالکل آزاد کر لیتا ہے۔

چنانچہ صبر و شکر کی تلقین بھی اسی نصیحت کی ایک شکل ہے۔ جس طرح صبر و شکر کی تلقین کر کے لوگ اپنی تمام ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر اور مظلوم یا ستم رسیدہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح نصیحت کر دینے کے بعد نصیحت کرنے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس پر کسی اور قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کوئی شخص فاقہ کرتے کرتے روٹی کا ایک ٹکڑا چرا لے تو ناصح یہ نہ کرے گا کہ عدالت میں مقدمہ کی پیروی کرے یا بھوکے کو برسرِ روزگار لگانے کی فکر کرے۔ وہ صرف یہ بتا کر فارغ ہو جائے گا کہ چوری کرنا بہت بُری بات ہے۔ شرفا ایسا نہیں کرتے اس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہوتا ہے وغیرہ۔ وہ کبھی اس پر غور نہ کریگا کہ چوری کرنا ضرور بُری بات ہے لیکن فاقہ سے ہلاک ہو جانا اس سے بھی بُرا ہے شرفا چوری کریں یا نہ کریں فاقہ کش کو ایسا ضرور کرنا چاہئے دوسروں کی حق تلفی اتنی سنگین بات نہیں ہے جتنا اپنے حقوق سے محروم ہونا عبرت ناک اور دردانگیز ہے۔ عبادت کی مانند نصیحت کو پیشہ بنا لینا بڑی نامعقول بات ہے۔

یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے ناصح کو ہمیشہ بُرا سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ اردو شعر و شاعری میں واعظ یا زاہد کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے کسی کی ہمت افزائی نہیں ہو سکتی۔ واعظ و ناصح کے زمرہ میں زاہد، چارہ گر اور والدین قسم کے تمام لوگ آ جاتے ہیں۔ والدین قسم سے مراد ایسے لوگوں سے ہے جو اپنے لڑکوں سے ایسا سلوک کرتے ہیں اور اس قسم کی باتیں کرتے ہیں گویا آخرت نوجوانوں کے لئے اور دنیائے دوں ان بزرگوں کے قیام و طعام کے لئے مخصوص ہے!

اردو شعر و شاعری میں واعظ یا ناصح کے بارہ میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اور جس طرح سے کہا گیا ہے اُن سے ہم خوب واقف ہیں اور ان پر ہنسے بھی خوب ہیں۔ اکثر واعظ و ناصح پر، بیشتر خود اردو شاعری پر، اردو شاعری پر ہنسنا بڑی نادانی کی بات ہے۔ اس پر رونا اور بھی بُرا ہے ہماری شاعری میں ناصح، واعظ، زاہد، رند، عاشق، محبوب، بوالہوس، محبت، رشک، نفرت، جانبازی اور اس قسم کی جن اور باتوں کا ذکر آیا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض طبائع ایسے بیان یا اسلوب اظہار کو پسند نہیں کرتیں جو ہماری شاعری کا اوڑھنا بچھونا ہی نہیں بلکہ جادو کی وہ چھڑی ہے جس کے ہلانے گھمانے سے کائنات اپنے اسرار بے نقاب کرنے لگتی ہے۔

لیکن ذرا ٹھیرئے آج کی صحبت میں میرا فرض یہ ہے کہ میں آپ کو اردو شعر و شاعری کے انہیں اوراق سے آشنا کراؤں جن میں صرف واعظ و ناصح کے خط و خال نمایاں کئے گئے ہوں۔ اس لئے میں آپ کے سامنے

جستہ جستہ ایسے نمونے پیش کرتا ہوں جن میں آپ کو ناصح کا حلیہ یا کردار نہایت واضح اور دلچسپ نظر آئے گا۔ واعظ یا ناصح کی تدریجی نقاب کشائی پر نظر رکھتے ہوئے سنئے۔

اٹھواؤ میز سے مے و ساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

یا

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

یا

داڑھی کے ساتھ ہی سر اقدس گھٹا ہوا
اب ہو گئی ریاض تو اک پشت خار کی

مکمل سراپا اب ملاحظہ ہو

ہم نے دیکھا طرف میکدہ جاتے تھے ریاض
اک عصا تھامے عبا پہنے عمامہ باندھے

ایک عصا تھامے' عبا پہنے' عمامہ باندھے' کا مکمل نقشہ آپ کے ذہن میں نہیں آتا تو کسی تقریب کا انتظار کیجئے جہاں اس قسم کی چیز اکثر دیکھنے میں آجاتی ہے یا پھر ٹیلی وژن کے عام ہو جانے پر آپ ان کا مشاہدہ گھر بیٹھے کر سکیں گے۔

واعظ یا ناصح کے کردار یا کرتوت کا اندازہ کرنا ہو تو یہ شعر سنئے:-

ملے تو حشر میں لے لوں زبان واعظ کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لئے

عاشق کو ان بزرگ کے نیک خیال ہونے کا یہاں تک خوف ہے کہ وہ کہتا ہے:-

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

عاشق خوب جانتا ہے کہ ناصح کی گفتار بے اثر ہوتی ہے۔ اتنی بے اثر کہ وہ ڈرتا ہے کہیں گفتگو کرنے سے غریب کی آہ وفغاں بھی بے اثر نہ ہو جائے۔

عاشق ناصح کی گفتگو کو محض ایک طوفان تکلم سمجھتا ہے۔ طوفان تکلم ہی نہیں بلکہ خود اس کے طوفان تکلم ہونے کا اسے خدشہ ہے۔ عاشق ترک محبت کو محالات سے سمجھتا ہے۔ ناصح کی تلقین کو ایک فرضی کہانی سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ شب فراق میں جب اسے نیند نہیں آتی اور کوئی افسانہ خواں نہیں ملتا تو کہتا ہے۔

لگ جائے آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح کو لے آؤ اگر افسانہ خواں نہیں

عاشق کو یقین ہے کہ ناصح عقل سے عاری ہے ہمدردی سے اسے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ تنگ نظر ہے۔ اور اس قابل نہیں کہ اس سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے جائیں پھر بھی کبھی کبھی وہ اپنے جذبۂ نفرت وحقارت کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور محض اس بناء پر کہ ناصح کی گفتگو کو محبت سے ایک طرح کی نسبت حاصل ہے اس کی باتوں کو انگیز کر لیتا ہے۔

اور خود ناصح کو ایسی بات سمجھاتا ہے جو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی تھیں۔ عاشق کا یہ درجہ اتنا بلند اور اتنا ولولہ انگیز ہوتا ہے کہ ہم ناصح کی ناقابل رشک پوزیشن کو یک قلم فراموش کر دیتے ہیں۔

مثلاً

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

نہ مانوں گا نصیحت پر وہ سنتا تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

غالب نے اپنے خاص انداز میں ایک جگہ ناصح کی حیثیت بیان کی ہے۔ جس کے دو مختلف لطیف پہلو خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ یعنی۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

نصیحت سے دنیا کے کارخانے کا کوئی گوشہ یا ہماری زندگی کا کوئی پہلو خالی نہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو ماضی کا ورثہ حال کے توسل سے مستقبل کو پہنچاتی ہے۔ اسی آنکھ سے ہم مستقبل کی تاریکیوں میں راستے پیدا کرتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔ آج ہم جو کچھ دیکھتے پاتے ہیں۔ اس میں اس رہبری کا کتنا دخل ہے جو ہمارے پیشرووں کی نصیحت سے ہم کو پہنچی ہے۔

دنیا کی تاریخ نصیحتوں ہی کا آئینہ ہے۔ لیکن دنیا کی بہت بڑی محرومی یہ ہے کہ لوگ دوسروں کو نصیحت نہیں کرتے بلکہ نصیحت کے پردے میں اپنا پروپگنڈا کرتے ہیں۔ یا دوسروں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ غور کیجئے یورپ میں کون کسے نصیحت کرتا ہے۔ کیوں کرتا ہو اور کیا کرتا ہو۔

لیڈر اپنی جماعت کو نصیحت سے کیسے کیسے سبز باغ دکھاتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو نصیحت نہیں کرتے فضیحت کرتے ہیں نصیحت کی آڑ میں اپنے کینہ کو تسکین دیتے ہیں کتنے ایسے ہیں جو اخلاق و مذہب کی تلقین ہی اس لئے کرتے ہیں کہ معقول لوگوں کو عذاب الٰہی ہی کی بشارت دے کر اپنے جذبۂ حسد و غضب کو تسکین پہنچائیں۔

بعض لوگ نصیحت کرتے ہیں لیکن ان کی نصیحت پر عمل نہ کیجئے تو کسی وقت گولی سے ہلاک کر دئے جانے کا اندیشہ رہتا ہے ورنہ تاحیات زنقین" انکی دشمنی مسلم۔ یہ اللہ واسطے نصیحت کرتے ہیں اور نہ مانئے تو بندہ واسطے پیٹ پھاڑ ڈالنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

ایسوں کی نصیحت سننی کوئی قابل رشک پوزیشن نہیں ہو انتخابات البتہ یاد رکھئے کہ جب موقع نازک اور ہر طرف مایوسی اور تاریکی نظر آئے تو اپنے مخلص ترین دوستوں سے مشورہ کیجئے اور ان کے مشورہ یا نصیحت پر عمل کیجئے۔

مخلص دوست کی نصیحت یا مشورہ الہام ہوتا ہے جس سے زیادہ سچی اور کاری بات آج تک دریافت نہیں کی جا سکی ہے۔

ادبیات :-

جذبات مبارک

از حضرت مبارک عظیم آبادی

چشم پر فن تری چھپ چھپکے ہو ہر سو پیدا — سوجھا ہوں یہ بھی ہو نرگس جادو پیدا
سوز وہ سوز ہو جو خرمنِ ہستی پھونکے — دل وہ دل ہو جو کرے درد کا پہلو پیدا
جب نکالی گئی تلوار سنبھالی نہ گئی — قتل کا شوق ہو تو کیجئے بازو پیدا
آفرینش کی دعائیں کبھی کرتے تھے مگر — اب یہ کہتے ہیں الٰہی نہ ہوں خوشرو پیدا
ضبطِ گریہ پہ کہا تو یہ کہا ظالم نے — درد اُٹھے دل میں تو ہو آنکھ میں آنسو پیدا
لے اُڑی نکہتِ گل پھر ترے دیوانوں کو — پھر کھلے پھول ہوئی پھر تری خوشبو پیدا
لاکھ تیروں کے برابر ہو تری ایک نگاہ — لاکھ تلوار کریں گے ترے ابرو پیدا
دی بشارت یہ نسیم سحری نے ہر سو — غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ ہوئی بو پیدا
روگ آنکھوں کو مبارکؔ ہو نظر بازی کا — اک نہ اک ڈھونڈکے ہم کرتے ہیں گیسو پیدا

رقصِ بسمل

از جناب سکھدیو پرشاد سنہا صاحب بسملؔ الٰہ آبادی

بہ قید یک قافیہ

کتنی سلجھی ہوئی یہ سوجھ ہے دیوانوں کی — رات دن خیر مناتے ہیں گریبانوں کی
یہ جنوں اور یہ کج دھج ترے دیوانوں کی — ہنس کے سب دیکھتے ہیں شکل گریبانوں کی
موسم گل میں یہی رائے ہے دیوانوں کی — دھجیاں اب ہوں لگاتار گریبانوں کی

ہے نظر حلقۂ زنجیر پہ دیوانوں کی
آگئی یاد انہیں اپنے گریبانوں کی

آئی جب حشر میں باری ترے دیوانوں کی
دھجیاں پیش ہوئیں پہلے گریبانوں کی

شانِ دنیائے جنوں دیکھ لے دیوانوں کی
سب نے کھائی ہے قسم اپنے گریبانوں کی

پوچھ کچھ حشر میں ہوگی نہیں دیوانوں کی
خوب بن آئی یہاں چاک گریبانوں کی

پھول کے بدلے چڑھا جاتے ہیں اہلِ وحشت
دھجیاں تربتِ مجنوں پہ گریبانوں کی

گلِ صد برگ کو وہ دیکھ کے بولے بسملؔ
خاص پہچان ہے یہ چاک گریبانوں کی

کلامِ ولیؔ

از جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب ولیؔ کاکوی ام۔ اے ڈپٹی مجسٹریٹ موتیہاری

بال سامانِ بلا ہے آنکھ سامانِ ستم
ہے سراپا یار کا اک محشرستانِ ستم

رخصت اے صبر و خرد اے زہد و تقویٰ الوداع
آفتِ جاں چال ہے چتون ہے پیکانِ ستم

گوشۂ دل میں ہے پنہاں اک جہانِ بیخودی
قطرہ ہر اشک میں مضمر ہے طوفانِ ستم

پائے وحشت زاہے وقفِ جادۂ دشتِ بلا
ہے سرِ شوریدہ رہنِ فکرِ زندانِ ستم

اے دلِ بیتاب شب آخر ہے عرضِ شوق کر
وہ نظر آتے ہیں اب کچھ کچھ پشیمانِ ستم

چھپ نہیں سکتا کبھی محشر میں قاتل جرمِ قتل
خونِ حسرت سے مرے رنگیں ہے دامانِ ستم

حاجتِ رہبر نہیں کامل ہے جب نے ذوقِ طلب
گمرہی اپنی ہے خود خضرِ بیابانِ ستم

حبذا اے شوقِ ایذا مژدہ اے ذوقِ خلش
دستِ قاتل میں نمایاں ہے نمکدانِ ستم

ہیں شریکِ قتل ناز و عشوہ و غمزہ ولیؔ
ایک جانِ ناتواں اور اتنے سامانِ ستم

رنگِ شفق

از حضرت شفق عمادپوری یادگارِ امیر مینائی

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مشاعرے میں)

اُٹھ رہی تھی میری میت ہر طرف کہرام تھا ۔۔۔ ایسے موقعے پر بھی ہنس لینا تمہارا کام تھا

کون صاف اُسکا بتاتا نام جس کا کام تھا ۔۔۔ کچھ زمانہ کچھ مقدر۔ کچھ فلک بد نام تھا

خاص میخانے میں بھی ساقی کا فیضِ عام تھا ۔۔۔ سب کے حصے میں بقدرِ ظرف اک اک جام تھا

سات پردے چشمِ موسیٰ کے ہوئے حائل مگر ۔۔۔ اک جھلک میں طور پردہ رازِ طشت از بام تھا

دیر کیا ہم نے حرم میں جاکے بھی دیکھا یہی ۔۔۔ جلوہ گر تھا وہ صنم آگے خدا کا نام تھا

اُنکی پہلی ہی نظر میں کام ہو جانا تمام ۔۔۔ ابتدا کی انتہا۔ آغاز کا انجام تھا

سونیوالے سو رہے جب سر سے چادر تان کر ۔۔۔ حشر تک زیرِ زمیں آرام ہی آرام تھا

بیکسوں کا کون تھا دلسوزِ بالینِ لحد ۔۔۔ صبح تک جل بجھنے والا اک چراغِ شام تھا

دیر اتنی ہوگئی ساقی کہ تیرے دور میں ۔۔۔ پہلے ساغر سے ادھر لبریز میرا جام تھا

اُڑ کے سو ٹکڑے بھی دیوانوں میں باقی رہ گیا ۔۔۔ چار انگل کا جو اک پرزہ گریباں نام تھا

آج اُس کا آب و دانہ کیا قفس سے اُٹھ گیا ۔۔۔ کل تک اے صیاد جو تیرا اسیرِ دام تھا

بند آنکھیں ہوتے ہی ہستی کا عقدہ کھل گیا ۔۔۔ دوسری اک زندگی تھی موت جس کا نام تھا

خاص اُسکے دیکھنے والے جو تھے کیا دیکھتے ۔۔۔ عرصۂ محشر جواب جلوہ گاہِ عام تھا

میں جو وقتِ ذبح تڑپا میری بے صبری تھی ۔۔۔ تیز خنجر کو تو کر لینا تمہارا کام تھا

بے نشاں ہوکر بھی رنگ اپنا جمانیکے لئے
سرخیِ عنوان گمنامی شفق کا نام تھا

نوائے فراق

از جناب رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے گورکھپوری پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی

نگاہِ ناز کی بیگانگی بڑھا آئے
گئے تھے حال سنانے اُسے سنا آئے

دیارِ عشق بھی ہو آئے تیرے خانہ خراب
فنا بقا کو بیک وقت آزما آئے

جو تیری ایک نظر کے خراب ہو کے پھرے
وہ لوگ بگڑی ہوئی زندگی بنا آئے

بیانِ درد ہے ممنون ہوں توجہ کا
نہ دیکھ اگر مری آنکھوں میں اشک سا آئے

غبارِ ہستیٔ فانی کو کر سکیں اِکسیر
جلے دلوں کو بھی شاید یہ کیمیا آئے

اڑا کے رنگ محبت کا دل کیے زخمی
چمن کو لوٹنے والے چمن کھلا آئے

میں مٹ رہا ہوں محبت میں اس گھڑی دل کو
ندامت آئے تری یاد آئے، کیا آئے

وفا کی راہ میں کیا ذکر رنج و راحت کا
متاعِ بیکسیٔ عشق بھی لٹا آئے

کہو کہ حسن بھی اکثر خراب رہتا ہے
کوئی نہیں جسے ہر درد کی دوا آئے

ترے فسردہ دلوں نے یہ کیا کیا اندھیر
جہاں جہاں گئے اک آگ سی لگا آئے

ترا خیال تری آرزو تری حسرت
انھیں سے ہم تو کئی بستیاں بسا آئے

تری نگاہ اگر مل گئی تو پھر کیا ہے
وگرنہ ہم تو دو عالم کے راز پا آئے

بقدرِ شوق بڑھا حسن کے تغافل کو
بوقتِ پرسشِ پنہاں اگر حیا آئے

تری طرف ہے محبت کی قوتِ تخریب
بنا کوئی نئی دنیا اگر بنا تو آئے

سکوتِ ہجر بھی آوازِ بازگشت نہ ہو
پیام ہی تو ہے اُس کا نہ آئے یا آئے

خرامِ ناز ہے اور وسعتیں ہیں عالم کی
قریبِ غمکدۂ دل تری بلا آئے

نگاہ دیدۂ بیخواب۔ جاگنے کی طرح
جو جاگ بھی نہ سکے اس کو نیند کیا آئے

دم بپاسِ عنایت میں کروں گا اگر
فراق اشک سے آنکھوں میں تھرتھرا آئے

"علم سے ہند کو جنت کر دے"

از مولوی سید ناظر امام صاحب بنجود، ندوی استاذ بادی ہاشمی ہائی انگلش اسکول گیا

"۱۳؍ اپریل کو ہمارے صوبہ میں تحریک اشاعت تعلیم کی جو سالگرہ منائی گئی تھی اس تقریب سے ذیل کی نظم لکھی گئی جسکو ہاشمی اسکول گیا کے طلبہ جلوس میں ترانہ کی شکل میں پڑھ رہے تھے۔"

علم ہے ارفع علم ہے اعلا
علم نرالی شانوں والا
ذرے کو چمکانے والا
علم کے ہی دم سے ہے اجالا

یارب دور جہالت کر دے
علم سے ہند کو جنت کر دے

علم بنی آدم کا زیور
تاج سر کسریٰ و قیصر
علم کے رتنوں سے تھی سراسر
زینت دامن عہد اکبر

یارب دور جہالت کر دے
علم سے ہند کو جنت کر دے

طبع رواں کی علم غذا ہے
ذہن کی اس سے نشو و نما ہے
آدمیت کی اس سے جلا ہے
ذرہ خورشید اس سے بنا ہے

یارب دور جہالت کر دے
علم سے ہند کو جنت کر دے

علم سے ہے انسان کی عزت
علم ہے زینہ بام رفعت
عدل و حکومت زرع و تجارت
ہر شعبے میں ہے اس کی ضرورت

یارب دور جہالت کر دے
علم سے ہند کو جنت کر دے

شبلی شبلی حالی حالی
علم کے سب ہی تھے شیدائی
کیسے نے کچھ تم سمجھے بھی
جب تو اتنی عزت پائی

یارب دور جہالت کردے
علم سے ہند کو جنت کردے

جناح۔ گاندھی۔ مسولینی ہٹلر
چرخ شہرت کے یہ اختر
نہرو۔ کمال، اقبال اور جوہر
علم سے پہونچے اس رتبے پر

یارب دور جہالت کردے
علم سے ہند کو جنت کردے

اپنی مسند پر اڑنا کیسا
مونچھ کی خاطر لڑنا کیسا
غصہ کرنا بگڑنا کیسا
آپس میں یہ جھگڑنا کیسا

یارب دور جہالت کردے
علم سے ہند کو جنت کردے

جان چکا جب مسلم کا منشا
مل جا باہم انجم کم سا
ہندو پھر یہ تامل کیسا
رونق بزم امکاں ہو جا

یارب دور جہالت کردے
علم سے ہند کو جنت کردے

پریت ملار

از حضرت عرشی امرتسری

جب آدھی رات کی تنہائی
کرتی ہو دل کو سودائی
جب دنیا محو راحت ہو
عاشق مجبور فرقت ہو
تم ایسے وقت میں آجانا
پیاری صورت دکھلا جانا
جب ساون [illegible] جوبن پر
ہو مدھ کی برکھا گلشن پر
آموں پہ جھولے جھلتے ہوں
پھولوں کے کٹورے ڈھلتے ہوں

تم ایسے وقت میں آجانا — اور پریت ملار سنا جانا

جب سکھیاں سکھ سے سوتی ہوں — سرشار مسرت ہوتی ہوں — اور کوئی میرے پاس نہ ہو — تم سے ملنے کی آس نہ ہو

تم ایسے وقت میں آجانا — مجھ کو حیران بنا جانا

جب یہ فرقت کی بیماری — جب یہ الفت کی خونخواری — بڑھ کر بے حد و نہایت ہو — اور روح آمادۂ رخصت ہو

تم ایسے وقت میں آجانا — اور کچھ دن اور جلا جانا

جب دامن کوہ کی وادی میں — سبز و گلپوش آبادی میں — میں غم کے ترانے گاتی ہوں — اور اپنا من پرچاتی ہوں

تم ایسے وقت میں آجانا — دکھیا دل کو پرچا جانا

چشموں کے فطری سازوں میں — شیریں دلکش آوازوں میں — جب میرا من نہ بہلتا ہو — جاں کڑھتی ہو جی جلتا ہو

تم ایسے وقت میں آجانا — اور دل کی لگی بجھا جانا

جب فرقت کو مدت گذرے — بھر جائیں زخم محبت کے — جب مٹ جائے دکھ الفت کا — پھر آئے زمانہ راحت کا

تم ایسے وقت میں آجانا — اس آگ کو پھر بھڑکا جانا

دنیائے تصور

از مولوی سید محمد عبد الغفار صاحب ضیا ندوی نگرامی مہتمم مدرسۂ عربیہ بدریہ نگرام ۔ لکھنؤ

ہجر کی بھیگی رات میں قلب تھا اضطراب میں — آنکھیں جھپکیں تو آسماں حسن تھا ماہتاب میں

میرے خیال میں تھے وہ چاند سے کہہ رہا تھا میں — عمر گذر گئی تری درخور آفتاب میں

کذب کو دخل دے نہ گر تو یہ بتادے تو مجھے — کس کا رخ نگار ہے میرے دل خراب میں

کس کی جبین ناز میں برق کی ہیں تجلیاں — کس کا غرور حسن ہے عالم پیچ و تاب میں

آگ کنار بحر ہے تیرے سکون کی جھلک — سن کر مری نوائے غم اس نے کہا جواب میں

سنکے پتہ کی بات جب دل کو سکوں نہ ہو سکا — آگ کنار بحر میں ڈوب گیا حجاب میں

سوز دروں فزوں ہوا آگ سی تن میں لگ گئی — دیدہ و دل جھلک اٹھے لہر تھی آب و تاب میں

آنکھیں جھپک گئیں مری نیند سی گویا آگئی — میرے گلے وہ مل گئے ناز سے آکے خواب میں

چھپٹے آنکھیں کھل گئیں ڈوب گیا دل اخیر میں — سوچ یہ مجھکو ہوگیا ہیں وہ بڑے عتاب میں
بت کی ادائے ناز نے پھر مجھ سے کہا کہ دیکھئے — برکت دین و سعد ہوا بھر ہوئے شباب میں

بڑھ کے ضیا نے پوچھا لو ان سے کہیں ابھی قریب
آنکھوں میں ہے خمار یا رنگ شراب ناب میں

برسات اور ساقی

از جناب شفیق قادری' سونبرساوی

دل پہ اپنے پھر کہاں قابو رہا برسات میں — جب گھٹا وہ گھر کے آئی ساقیا برسات میں
گر پڑی بجلی جناب شیخ کی نیت پہ بھی — دیکھ کر ہر سمت وہ کالی گھٹا برسات میں
تشنہ لب بیٹھے ہیں ہم اور بند میخانہ ہے جب — اس سے تو توبہ بھلی ہے ساقیا برسات میں
بارش لطف و کرم کا کیا ہی موقع خوب ہے — اور اک برسات ہو ائے ساقیا برسات میں
اک فقط ہم ہی نہیں مضطر جدائی میں تری — آسماں بھی رو رہا ہے ساقیا برسات میں
پھر گھٹا گھنگھور اٹھی پھر چلی ٹھنڈی ہوا — پھر چلے دور کرم لے ساقیا برسات میں
ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے جوش پر ساقی بھی ہے — اصل میں ہے بادہ نوشی کا مزا برسات میں
آج فیاضی کو تیری دیکھ کر اے ساقیا — پانی پانی شرم سے ہے وہ گھٹا برسات میں

ہے شفیق بادہ کش کی تجھ سے اتنی آرزو
کاگ بوتل کا اڑے پھر ساقیا برسات میں

تصویر جذبات :-

ابدی محبت

از جناب سید عزیز الحسن صاحب صبا بازید پوری

تمہاری جوانی گزر گئی، مگر میں تم کو اب بھی ویسا ہی
مانتا ہوں جیسا پہلے مانتا تھا۔

تمہارے نرم و نازک گال، جن پر معصومیت کھیلتی
رہتی تھی، پچک گئے مگر میری نظر کو وہ اب بھی ویسے ہی پیارے
ہیں جیسے پہلے تھے۔

تمہاری رسیلی آنکھیں اب ایسی نہیں ہیں جن کے اشارے
سے زمانہ جنبش میں آتا تھا ——— مگر پھر بھی میرے دل کے لئے
باعث اضطراب ہیں۔ جب ان کو جنبش ہوتی ہے، میرا دل جنبش
میں آجاتا ہے۔

تمہاری تقوی شکن ادائیں ضعف پیری سے اب
ویسی نہیں جس کی ہر ہر حرکت پر اللہ والوں کی متاع دین و دانش
لٹتی تھی ——— مگر اب بھی میرے لئے غارتگری کا وہی
سامان بہم پہونچاتی ہیں، جو آج سے چند سال پہلے، جب تمہارے
اعضا سڈول اور بھرے تھے۔

تمہارے ہونٹ اب وہ ہونٹ نہیں، جن کی تازگی
و شگفتگی کے آگے گلاب کا پھول شرمندہ تھا ——— مگر
[illegible]

تمہاری رفتار اب وہ نہیں جس کے خیر مقدم
پہاڑ اپنی جگہ سے بڑھتا تھا اور سرو ——— سر بسجود
تھا ——— مگر اب بھی وہ میرے دل میں دھڑکن
دارغ بیل ڈال سکتی ہے ——— او چھی تلی رفتار
والی! ذرا محو خرام ہو جا ——— کہ میری کائنات
میں پھر ایک مرتبہ بھونچال آجائے۔

تمہاری مسکراہٹ اب وہ مسکراہٹ نہیں تمہار
جنبش لب اب وہ جنبش لب نہیں، جس سے میرے خیالات
شیرازہ بکھرنے لگتا تھا، جس سے کبھی دل سوزی اور کبھی د
داری کا پہلو نظر آتا تھا ——— مگر اب بھی تمہارا
تبسم مجھے حیات جاوداں بخشتا ہے ——— اے ہنس مکھ
پھر ایک بار مسکرا دے۔

تمہاری گفتگو سے اب پھول نہیں جھڑتے! مگر اب
بھی چاہتا ہے کہ گھنٹوں میں تم سے باتیں کرتا رہوں۔

تم اب سنوار نکھار سے دور رہتی ہو ———
آرائش جمال سے پرے! مگر اب بھی تم مجھے اتنا ہی پیاری نظر
آتی ہو جتنا پہلے۔

تھا مگر اب بھی میں اُس پر جان نثار کرنے کے لئے تیار ہوں۔

تمہاری زلفیں اب وہ زلفیں نہیں جو کسی زمانے
میں ریشم کی طرح چمکدار اور آبنوس کی طرح سیاہ تھیں ــــ
اور جو طرح طرح کے پھولوں سے معطر رہتی تھیں ــــ
مگر اب بھی وہ میری کائنات آرزو میں زلزلہ پیدا کرتی ہیں۔

تمہاری باہیں اب اُتنی مرمریں اور سڈول
نہیں ــــ مگر
اب بھی تم اگر میری باہوں میں باہیں ڈال دو تو مجھے
حیات دارین نصیب ہو جائے!

تمہارا جسم اب اتنا گرم نہیں، جس کے تصور سے
انسان پھنکا جاتا ہو ــــ مگر اب بھی جب
کبھی مجھے تمہارے جسم کی گرمی ــــ تمہارے نرم
و نازک جسم کی گرمی یاد آتی ہے، میں آتش شوق سے جلنے
لگتا ہوں۔

تمہاری جوانی کے ساتھ تمہارا حسن بے مثال رخصت
ہو چکا ــــ اور اب تم وہ نہ رہیں جو کسی زمانے
میں یا آج سے چند سال پیشتر تھیں۔

مگر چونکہ میری محبت کا تعلق صرف جسم ہی سے نہ تھا، بلکہ روح
سے بھی تھا۔ اس لئے تمہاری وہ ابدی محبت اب تک باقی
ہے ــــ اور جب تک دم میں دم ہے باقی رہے گی۔

علمی دنیا

انجمن ترقی اردو - گیا

انجمن ترقی اردو گیا کی بنیاد ۱۳ نومبر ۲۰ء کو ڈالی گئی تھی۔ لیکن بعض ایسے اسباب کی بنا پر جن کا تذکرہ چنداں ضروری نہیں اس کے کارکنوں میں اتحاد عمل کا جذبہ پیدا نہ ہو سکا کامل ایک سال کی خاموشی کے بعد گذشتہ ماہ محرم میں اس انجمن کے ذریعہ اردو کی خدمت گذاری کا خیال نئے سرے سے پیدا ہوا۔ مگر اتفاق وقت کہ اس کے بعد ہی شہر میں فرقہ وارانہ ہنگامہ پھیل گیا۔ اور کسی کو کوئی کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

*

ادھر تقریباً ایک مہینہ سے یہ تحریک نئے سرے سے زندہ کی گئی۔ ہمارے سنجیدہ پرجوش نوجوان مخلص جناب شفیق الرحمن صاحب وکیل نے اس کی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور جناب مخدوم محترم مولوی سید ابو محمد حسن امام صاحب آنثی رئیس گیا کو انکے زاویہ گمنامی سے بجبر باہر لایا گیا۔ اور جناب موصوف نے انجمن کی صدارت و رہنمائی پر آمادگی ظاہر فرمائی۔ چنانچہ انجمن کا ابتدائی مشاورتی جلسہ مولوی شفیق الرحمن صاحب کے در دولت پر ۹ اگست کو منعقد ہوا۔ اور پھر ۱۰ اگست کو جناب صدر محترم کے دولتکدہ حسین منزل میں انجمن کا جلسہ عام منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ اور شہر کے تعلیمیافتہ طبقہ میں جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہیں اردو کی خدمت کا جذبہ نئے سرے سے پیدا ہوا۔

*

اس جلسہ میں سب سے پہلے حضرت سید شاہ حسین الدین احمد صاحب علیہ الرحمہ کے سانحہ ارتحال پر تعزیت کی تجویز منظور کی گئی۔

اس کے بعد عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا، جو حسب ذیل ہے:-

صدر:- جناب سید ابو محمد حسن امام صاحب آنثی رئیس گیا

نائب صدر (۱):- مولوی شاہ تسیم الدین صاحب وکیل

" " (۲):- مولوی شفیق الرحمن صاحب وکیل

" " (۳):- مولوی نور محمد صاحب انجستم

سکرٹری:- سید ریاست علی ندوی

اسسٹنٹ سکریٹری (۱):- جناب اہ منیر خاں صاحب اختر بی اے - بی - ایل وکیل

" " (۲):- جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی بی اے - ال ال بی (علیگ)

*

اس کے بعد انجمن کے سکریٹری نے شہر میں اُردو کی خدمت انجام دینے کیلئے مختلف نوعیتوں کے کاموں کا ایک اجمالی خاکہ جلسہ میں پیش کیا جو پسند کیا گیا۔ اور آئندہ کام کرنے کے لئے مختلف سب کمیٹیاں بنانے کی متعدد تجویزیں منظور کی گئیں۔ اور یہ دیکھ کر غیر معمولی مسرت ہوئی کہ شہر میں اردو کے بہی خواہوں کی ایک بڑی تعداد عملی خدمات انجام دینے کے لئے تیار ہو چکی ہے۔

ذیل میں ان سب کمیٹیوں اور ان کے ارکان کے نام اور ان کے مقاصد کے متعلق مختصر اشارات درج ہیں۔ تاکہ اس صوبہ میں مختلف شہروں میں اسی طریق سے انجمن کی بنیاد ڈال کر کام کا آغاز کر دیا جائے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ اس ذریعہ سے بہت جلد نہ صرف یہ کہ ہم اردو کے سلسلہ کی بہت سی پیدا ہونے والی شکایتوں کو دور کریں گے۔ بلکہ اس ذریعہ سے اردو کی بنیادی خدمات بھی انجام پائیں گے۔

سب کمیٹیوں کو بنانے کے بعد جلسہ عام میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ انہی کے ارکان انجمن کی مجلس انتظامیہ کے ارکان منتخب کئے گئے۔

سب کمیٹیوں کے اسماء درج ذیل ہیں۔

مشاعرہ سب کمیٹی نمبر ۱

۱۔ جناب اودھ کشور صاحب کشتہ (داعی)

۲۔ جناب سید زین العابدین صاحب عابد منصف شہر

۳۔ جناب عبد الحفیظ صاحب سہروردی۔

۴۔ جناب برج کشور صاحب کیلا ایڈیٹر ....

۵۔ جناب قیصر گیاوی۔

(مقصد) ماہانہ مشاعرہ کا انتظام کرنا، اور مشاعروں کے ذریعے اردو زبان سے عام دلچسپی پیدا کرنا۔ اور اردو ادب و شاعری کا صحیح ذوق پیدا کرنا۔

پوسٹل سب کمیٹی نمبر ۲

۱۔ جناب آنریبل سید حسین امام صاحب (داعی)

۲۔ جناب شاہ مصطفےٰ احمد صاحب رئیس

۳۔ جناب ظہیر عالم صاحب

(نوٹ متعلق مقصد) ڈاکخانوں میں اردو کے حقوق کی حفاظت کرنا۔ اُردو کے فارموں کا ڈاکخانوں میں مہیا کرانا۔ اردو کے فارموں کے نہ ملنے پر اس کا تدارک کرنا۔ لوگوں کو ترغیب دینا کہ خط و کتابت اور پتوں کے لکھنے میں اُردو زبان استعمال کریں۔

لوکل سلف گورنمنٹ سب کمیٹی نمبر ۳

۱۔ جناب خواجہ جلال الدین صاحب وکیل (داعی)

۲۔ جناب مولوی محمد فاروق صاحب وکیل

۳۔ جناب قاضی محمد حسین صاحب

۴۔ مولوی عقیل حسن صاحب وکیل

۵۔ جناب حبیب احمد صاحب

(مقصد) محکمہ تعلیم، میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ

اردو کے حقوق کی نگہداشت کرنا۔ ان مقامی اداروں (لوکل باڈیز) کے میزانیہ (بجٹ) میں شعبۂ تعلیم کے لئے جو رقم منظور کی جائے اس پر مجموعی حیثیت سے نگہداشت کرنا کہ اردو ہندی کے دو شعبوں میں سے ہر ایک کے حصہ میں اس کے حصہ رسدی کے مطابق رقم تقسیم کی جائے۔ پھر گذشتہ سال جو رقم منظور ہو چکی ہو۔ اس کی نگرانی کرنا کہ سال ختم ہونے پر واقعی وہ رقم خرچ کی گئی ہے۔ پھر تعلیم کے مجموعی میزانیہ میں اردو کے لئے جو رقم نکالی گئی ہے اس کے مصارف کے مدوں کو دیکھتے رہنا۔

اردو کے مکاتب اور ہندی پاٹ شالاؤں کیلئے یکساں برتاؤ ہر حیثیت سے کئے جانے کی نگرانی رکھنا۔

تعلیمی سب کمیٹی نمبر ۴

۱۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب بسمل (داعی)
۲۔ جناب حکیم سید احمد صاحب شمسی
۳۔ مولوی عبدالعزیز صاحب
۴۔ مولوی ناظر امام صاحب ندوی
۵۔ ڈاکٹر احمد امام صاحب
۶۔ حافظ عبدالقدوس صاحب۔

(مقصد) شہر کے جن محلوں میں مکاتب قائم کرنے کی ضرورت ہو قائم کرنے کے وسائل مہیا کرنا۔ پہلے کے قائم مدرسوں کی زبوں حالی کو دور کرنا۔ لوکل باڈیز سے ان کے لئے ہر قسم کی آسانیاں مہیا کرنا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مناسب نصاب تعلیم تیار کرانا۔ لوکل سلف گورنمنٹ کمیٹی کے ارکان سے مل کر میونسپلٹی سے امداد جاری کرانا محکمہ تعلیم سے ان کا الحاق منظور کرانا۔

تجارتی سب کمیٹی نمبر ۵

۱۔ جناب نور محمد صاحب انجم (داعی)
۲۔ جناب عبدالکریم صاحب نجیبی
۳۔ مولوی جمال الدین احمد صاحب ندوی
۴۔ جناب رفیق عالم صاحب
۵۔ جناب مبارک نواب صاحب
۶۔ جناب شیخ شرافت حسین صاحب

(مقصد) تاجروں کو آمادہ کرنا کہ وہ اپنا حساب کتاب کیس میمو رسید کریڈٹ میمو لیٹر پیڈ نگ وغیرہ اردو زبان میں رکھیں۔ سائن بورڈ پر اردو زبان ضرور لکھیں۔ اور ان کا پورا کھاتہ بھی اردو زبان میں ہو۔ تاجروں کو آمادہ کرکے دوکانوں پر دورہ کرنا کہ وہ اس کے بموجب عمل پیرا ہیں۔

زمینداری سب کمیٹی نمبر ۶

۱۔ جناب بابو مشتاق علی خاں صاحب رئیس بدریا۔
۲۔ جناب انظار الحسنین صاحب
۳۔ جناب ڈاکٹر احسن التوحید صاحب
۴۔ جناب محمد ناصر فرید الاسلام صاحب

(مقصد) زمینداروں کو آمادہ کرنا کہ وہ اپنا دیہی حساب کتاب، اور رسید وغیرہ اردو میں لکھیں۔ اور تمام دیہی کاروبار اردو زبان میں انجام دیں۔

عدالت دیوانی سب کمیٹی

۱۔ جناب شفیق الرحمن صاحب وکیل (داعی)
۲۔ مولوی شاہ غلام مصطفےٰ صاحب وکیل
۳۔ مولوی جلیل الرحمن صاحب وکیل
۴۔ منشی خورشید حسن صاحب
۵۔ منشی فیض محمد خاں صاحب
۶۔ منشی نظام الدین صاحب

عدالت فوجداری و مالیات سب کمیٹی

۱۔ مولوی عبدالقادر صاحب مختار (داعی)
۲۔ جناب عمر دراز صاحب مختار
۳۔ مولوی عبدالخالق صاحب مختار
۴ مولوی علی حسن صاحب مختار
۵ سید منظور الحق صاحب عرف درگاہی میاں

(مقصد) مذکورہ بالا ہر سہ قسم کی عدالت میں اردو کو رواج دینا۔ جہاں انگریزی زبان لازمی نہ ہو ایسے موقع پر لازمی طور پر اردو زبان استعمال کرنا۔ اسمیں ہر قسم کی فردواشتیں یا اردو کے فارم استعمال کرنا۔ فارموں کے نہ ملنے پر اردو زبان کے استعمال کرنے سے اگر عوام کو دشواریاں پیش آتی ہوں تو ان کا مناسب حل نکالنا۔ اور اس سلسلہ میں ضروری تدبیریں اختیار کرنا۔ اور اگر کسی پیش آنے والی صورت کا حل انفرادًا ممکن نہ ہو تو اس کے متعلق انجمن کی مدد لینا۔ اردو کے حق میں حکام، عہدہ دار، کلرک وغیرہ اگر زیادتیاں کریں تو انجمن کو ان سے مطلع کرنا تاکہ ضروری کارروائی متحدہ طور پر عمل میں لائی جا سکے۔

ضروری اطلاع اشتہارات کے صفحہ ۴ پر دیکھنے کے بجائے ٹائٹل کے صفحہ ۳ پر ملاحظہ ہو۔

مسلسل افسانہ :۔

ٹارزن

یعنی

عجیب انسان

ازجناب محمد احسن صاحب پھلواری پوری آروی

کلیثن نے چلا کر کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ بھاگو جین بھاگو! جھونپڑی میں چڑھ جاؤ!، لیکن ان کی آواز سنکر بھی وہ نہ بھاگ سکی۔ اس کے پاؤں میں قوت ہی نہ رہی تھی۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑی ہوئی پھیلی ہوئی آنکھوں اور سفید چہرے سے ایک طرف بڑھتی ہوئی موت کو دیکھ رہی تھی۔

شیر کے گرجنے کی آواز سنکر فیورن جھونپڑی کے دروازہ پر آ گیا۔ اس نے جب یہ دیکھا تو بہت گھبرا کر روسی زبان میں چلا کر کہا بھاگو بھاگو ورنہ میں اس خوفناک جنگل میں تنہا رہ جاؤں گا! یہ کہتا ہوا وہ وہیں بیٹھ گیا اور رونے لگا۔

ایک منٹ کے لئے اس نئی آواز نے شیر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے اس درخت کی طرف دیکھا جس پر جھونپڑی تھی کلیثن اب خود کو سنبھال نہ سکے! انہوں نے شیر کی طرف پشت کر لی۔ اور ہاتھوں سے منہ چھپا کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

جین پورٹر نے متعجب ہو کر خوف زدہ نظر اپنے ساتھی پر ڈالی۔ اس نے سوچا کہ وہ وہیں کیوں کھڑے ہیں! اگر مرنے کا یقین ہی ہے تو کیوں نہیں بہادری سے لڑتے ہوئے جان دیتے کیوں نہیں اپنی پتلی ہی چھڑی سے اس کا منہ پیٹنا شروع کر دیتا حالانکہ ان کی سمجھ میں اس سے کوئی فائدہ نہ ہو سکتا اس موقع پر ٹارزن اس طرح خاموش رہتا کیا وہ بہادری سے لڑتا ہوا اپنی جان نہ دیتا؟

شیر اب جھپٹنے کے لئے پچھلی ٹانگوں کو سکوڑ رہا تھا۔ وہ اس جست کی تیاری کر رہا تھا جو اس دو لو

کی جانوں کا خاتمہ کر دینے والی تھی۔ کلیٹن خاموش کھڑے
ہوئے تھے۔ جین پورٹر بھی ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپا کر
گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی تاکہ آخیری ہولناک منظر
ر اس کی نظر نہ پڑے، اور پروفیسر جو جھونپڑی کے دروازہ پر بیٹھا ہوا
تھا رن بخار کی کمزوری کی وجہ سے بیہوش سا ہو گیا۔
س کے بعد منٹ گذرے اور منٹ بھی گذر کر گھنٹے
ے تبدیل ہو گئے لیکن شیر نہ اچھلا۔ کلیٹن خوف کی وجہ سے
لکل بدحواس ہو رہے تھے ان کے پاؤں کانپ رہے
تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ بیہوش
و جائیں گے۔

جین پورٹر ایسی حالت میں اور زیادہ نہ رہ سکی۔ اس
نے دل پر جبر کر کے آنکھیں کھول دیں لیکن کیا دیکھا وہ خواب
یہ رہی تھی!

اس نے آہستہ سے کہا: "ولیم! دیکھو!"

کلیٹن نے بہت جرأت کر کے شیر کی طرف گردن
ھمائی، اور ساتھ ہی ان کے منہ سے تعجب کی ایک ہلکی
نکل گئی ان کے بالکل ہی نزدیک شیر مرا ہوا پڑا تھا۔
لمبا برچھا اس کے بدن میں گھسا ہوا تھا وہ داہنے
نے کے پاس سے پشت میں گھستا ہوا اور کم از کم ڈیڑھ
گوشت کاٹتا ہوا کلیجے تک چلا گیا تھا۔

جین پورٹر اٹھ کے کھڑی ہوئی، ساتھ ہی اس کا
ر لڑکھڑا گیا لیکن کلیٹن نے ہاتھ کا سہارا دے کر
ں کو انہوں نے آہستہ سے اسے اپنے پاس کھینچ لیا اور

اس کا سر چھاتی سے لگا کر ہونٹوں کو چومنے کے لئے اپنا
منہ جھکایا۔ آہستہ سے انہیں اپنے ہاتھ سے ہٹا کر
جین پورٹر نے کہا:-

"نہیں اب ایسا نہ کرو ولیم! گذشتہ تھوڑے ہی
عرصہ میں مجھے ایسا معلوم ہوا ہے جیسے میں ہزاروں برس
زندہ رہ گئی ہوں اور اس دوران میں میرے پاس تجربات کا
کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے موت سامنے آئی لیکن میں اتفاق
سے نہ مری لیکن میں نے اس سے سیکھ لیا کہ زندہ کس طرح
رہا جاتا ہے میں تمہارا دل ضرورت سے زیادہ نہیں
دکھانا چاہتی صرف اتنا کہہ دینا چاہتی ہوں کہ کچھ عرصہ
پہلے میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے اب میں پورا کرنے
میں مجبور ہوں۔ میں نہ تو تمہیں دھوکا دینا چاہتی ہوں
نہ اپنے دل کو۔ میں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا ہے اور تمہیں
بھی بتا دیتی ہوں کہ اگر ہم متمدن دنیا میں پہنچ بھی گئے تو میں
تمہاری بیوی نہ بن سکوں گی"۔

کلیٹن نے تعجب سے چلا کر کہا "میں! جین تم کیا
کہہ رہی ہو! تمہارا مطلب کیا ہے! ہم خدا کے فضل سے
بچ گئے تو اس سے تمہارا پہلا خیال میرے خلاف کیوں
ہو گیا۔ تم شاید گھبرا گئی ہو۔ اپنے آپے میں نہیں ہو، اس
وجہ سے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ کل تم ٹھیک ہو جاؤ گی"۔

جین پورٹر نے کہا "میں اس وقت جتنے ہوش میں
ہوں اتنے ہوش میں گذشتہ ایک برس کے دوران میں
کبھی نہ تھی اس وقت کے واقعے سے میرا یہ خیال تازہ

ہوگیا ہے کہ ایک بہادر آدمی مجھ سے محبت کرنا چاہتا تھا لیکن اس وقت چونکہ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں یا نہیں، اس کی محبت کو میں نے قبول نہ کیا۔ اب وہ آدمی اس دنیا میں نہیں ہے دوسری دنیا میں چلا گیا۔ اس وجہ سے میں اب شادی کرنے کی خواہش کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیتی ہوں۔ شادی کر کے میں کروں گی کیا! کیا شادی کرنے کے بعد بھی اس بات کا خیال میرے دل سے نکلے گا کہ میرا شوہر اس آدمی سے کم بہادر ہے جس کے ساتھ شادی کرنا میں نے نامنظور کر دیا تھا! کیوں، تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے ہو یا نہیں؟"

کلیٹن کا چہرہ شرم کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا انہوں نے سر جھکا کر کہا "ہاں!" اس کے بعد ان کے منہ سے اور کوئی لفظ نہ نکلا۔

دوسرے روز ایک دوسری آفت آن پڑی،

باب ۵۰

اوپر کا خزانہ

شب کا کافی حصہ گزر چکا تھا کہ ٹارزن کو خبیث خانہ کے باہر کچھ کھٹکا سنائی دیا اور ساتھ ہی انھوں نے ہاتھ سے دیوار ٹٹولتی ہوئی بڑی پجارن لا کو اندر گھستے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی روشنی نہ تھی۔ شاید وہ اسے روشنی لانا اس نے نامناسب سمجھا ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھانے کا سامان اور دوسرے میں پانی سے بھرا ہوا ایک برتن تھا۔ روشندان سے ہو کر آتی ہوئی ماہتاب کی روشنی اندر خفیف اجالا پیدا کر رہی تھی۔ اس نے لا کر سب سامان زمین پر رکھ دیا۔

ٹارزن کوٹھری میں ایک طرف اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ آہٹ پا کر وہ اٹھے اور آگے بڑھ آئے۔

عورت نے انہیں دیکھتے ہی آہستہ آواز میں کہا "وہ دیوانے ہو رہے ہیں، غصہ سے اپنے آپے میں نہیں ہیں آج تک کوئی بھینٹ ان کے ہاتھ سے نکل کر بھاگی نہیں ہے تم بچ گئے ہو اس وجہ سے خداوند آفتاب کے عتاب کے خوف سے وہ بہت کوشش سے تمہاری تلاش کر رہے ہیں انھوں نے پچاس آدمی تمہیں ڈھونڈنے کے لئے قلعہ کے باہر بھیجے ہیں اور اس مندر کو شروع سے اخیر تک دیکھ ڈالا ہے۔ صرف یہی کوٹھری بچ گئی ہے۔"

ٹارزن نے دریافت کیا "وہ یہاں کیوں نہیں آئے؟"

عورت نے جواب دیا "اس وجہ سے کہ یہ خبیث خانہ ہے۔ یہاں خبیث آتے ہیں اور وہ اگر کسی آدمی کو یہاں پاتے ہیں تو —— یہ قربانگاہ تم دیکھ رہے ہو اسی پر اسے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اسی خوف سے میرے آدمی یہاں نہیں آتے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہاں آئیں گے تو پھر زندہ باہر نہ نکل سکیں گے!"

ٹارزن نے کہا "لیکن تم کیوں آئی ہو؟"

عورت نے کہا "میں یہاں کی بڑی پجارن ہوں۔ خبیث میرا کچھ نہیں کر سکتے۔ میں ان کے

باہر سے آدمی پکڑ کر بسینٹ چڑھانے کے واسطے لاتی ہوں وہ مجھ سے خوش رہتے ہیں۔"

ٹارزن نے ہنس کر کہا "لیکن تمہارے خبیثوں نے میرا تو ابھی تک کچھ نہیں بگاڑا ہے!"

عورت نے ایک عجیب نظر سے تھوڑی دیر ٹارزن کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اس نے کہا "بڑی پجارن کا فرض ہے کہ مذہب کو سمجھے اور دوسروں کو اسکی تعلیم دے۔ اگلے لوگ جیسا لکھ گئے ہیں اور جو قاعدے بنا گئے ہیں ان پر لوگوں کو چلائے، لیکن یہ اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ سب باتوں پر خود بھی یقین کرے۔ جو اپنے مذہب کو جتنا زیادہ جانتا ہے اتنا ہی اس کا یقین اس پر کم ہو جاتا ہے۔

"تم میرے بھاگنے میں مدد کرنے سے شاید اس وجہ سے ڈرتی ہو کہ لوگ تمہارے دھوکا دینے کا بھید جان جائیں گے اور تم پکڑی جاؤ گی!"

عورت نے کہا "ہاں، اصل بات یہی ہے لیکن اب زیادہ سوچنے اور دیر کرنے سے کام نہ چلے گا۔ میں تمہارے مددگاروں کا سامان آج انہیں دھوکا دے کر اور ان کی آنکھوں سے بچا کر لائی ہوں۔ ہر روز ایسا نہ کر سکوں گی اس وجہ سے اب یہاں سے نکل جانا اچھا ہوگا۔ چلو اٹھو اور میرے ساتھ آؤ۔"

عورت ٹارزن کو ساتھ لے کر پھر اسی کوٹھری میں پہنچی جو قربانگاہ کے کمرے کے نیچے تھی اور جس میں پہلے وہ تھوڑی دیر رہ چکے تھے۔ اس کے متعدد دروازوں میں سے کس میں وہ داخل ہوئی یہ ٹارزن اندھیرے میں دیکھ نہ سکے۔ غدار راستہ پر ٹٹول کر چلتے ہوئے وہ دونوں ایک بند دروازہ کے پاس پہنچے۔ عورت نے ٹٹول کر اپنے کپڑے کے اندر سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور ایک چابی قفل میں لگائی۔ ہلکی کرکراہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر گھسے۔

عورت نے کہا "تم یہاں کل رات تک حفاظت سے رہ سکتے ہو۔ میں پھر آؤں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ باہر چلی گئی اور دروازے میں پھر اس نے قفل لگا دیا۔

ٹارزن جہاں کھڑے تھے وہ جگہ بہت تاریک تھی۔ انکی تیز آنکھوں کو وہاں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ انھوں نے ہاتھ پھیلایا اور اندازے سے ایک طرف بڑھے۔ ایک لمحہ کے بعد ان کے ہاتھ ایک طرف کی دیوار سے ٹکرائے۔ اس کے سہارے چلتے ہوئے وہ کمرے میں چاروں طرف گھومنے لگے۔

انہیں یہ کوٹھری تقریباً بیس فیٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی معلوم ہوئی۔ فرش سیمنٹ اور چونے کا مضبوط بنا ہوا تھا اور دیواریں ویسی ہی تھیں جیسی انھوں نے کئی جگہ اوپر کی عمارتوں کی دیکھی تھیں۔ سنگ مرمر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے ایک کے اوپر ایک اس کاریگری سے بٹھائے گئے تھے کہ مصالحہ کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اور دیوار اتنی ہی مضبوط بن گئی تھی جتنی مصالحہ کے ذریعہ بنتی۔ (باقی)